الاصلاح

دائرہ حمیدیہ کا ماہوار علمی و مذہبی رسالہ

مرتبہ

امین احسن اصلاحی

2/67

Scanned by CamScanner
Scanned by CamScanner
Scanned by CamScanner

نمبر ۹ | ماہ جمادی الثانیہ ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۳۶ء | جلد ۳

فہرست مضامین

شذرات — امین احسن اصلاحی — ۲ - ۸

معارف قرآن

تفسیر سورہ عبس — استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ — ۹ - ۲۲

تدبر قرآن — امین احسن اصلاحی — ۲۳-۳۴

مذاکرہ

استدراک بر "نظر" — جناب مولوی اختر احسن صاحب اصلاحی — ۳۵-۵۲

ادبیات

کلام سہیل — جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل وکیل اعظم گڈھ — ۵۳ -

تلخیصات

فلسطین — جناب عبد الحکیم صاحب بی - اے — ۵۴ - ۶۱

تقریظ و تبصرہ — ع - ن — ۶۲ - ۶۴

Scanned by CamScanner

شکریات

اگست کے پرچہ میں ہم نے چھوٹے بچوں کیلیئے ایک علٰحدہ دارالاقامہ کی تعمیر کیلیئے اپیل کی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مدرسۃ اور قوم کے ہمدردوں نے اس اپیل پر توجہ فرمائی۔ ابتک اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل عطیے مل چکے ہیں۔

(۱) جناب حاجی، حافظ، ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب صدر دائرہ حمیدیہ (سول سرجن پرتاب گڑھ) ۵۰۰ روپئے۔

(۲) جناب شیخ محمد سلیمان صاحب رکن دائرہ حمیدیہ (ساکن مرزاپور اعظم گڑھ) حال مقیم رنگون ۶۶۰ روپئے۔

(۳) از موضع پھریہا ۱۹ روپئے ۳ آنے ۶ پائی۔

(۴) جناب علی محمد صاحب سنجرپوری اسٹیشن ماسٹر سرائمیر ۵ روپئے ۸ آنے

(۵) جناب منشی علاء الحق صاحب (بندول) ۵۰ روپئے (وعدہ)

(۶) جناب مولوی حمید احمد صاحب انصاری، مسجل جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ۲۰۰ روپئے (وعدہ)

جناب شیخ نورالحسن صاحب (برامد پور) کی شرکت بھی اس کار خیر میں متعین ہو چکی ہے۔ لیکن انکی رقم کا اعلان بعد میں ہو سکیگا۔ ہم کو چھ کمرے بنوانے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مدظلہ نے ایک کمرہ کی رقم دیدی ہے۔ شیخ سلیمان صاحب نے ایک کمرہ کی لاگت سے زیادہ رقم دیدی ہے، لیکن وہ کسی کام کو ناتمام چھوڑنے کے عادی نہیں ہیں اس لئے ہم ان کے حصہ کے دوسرے کمرے کی طرف سے بھی بالکل مطمئن ہیں۔ اب صرف تین کمروں کا معاملہ رہ گیا ہے۔ ان کے لئے ہماری نگاہیں ان لوگوں کی طرف لگی ہوئی ہیں جنھوں نے مدرسہ کی صداؤں کو ہمیشہ سنا ہے اور اس کی ضرورتوں کے لئے ہمیشہ فیاض رہے ہیں۔

تعمیر کا ضروری سامان ہو رہا ہے۔ خدا نے چاہا تو اکتوبر کے آخر میں کام شروع ہو جائے گا۔ اور کوشش کی جائے گی کہ عمارت جلد سے جلد تیار ہو جائے۔ طلبہ کو نہایت تکلیف ہے اور ساتھ ہی ہم کو اپنے جدید نظام تربیت کے اجرا کے لیے عجلت بھی ہے۔

ان ہمدردوں کا اخلاص ہمارے شکر و سپاس سے بالاتر ہے۔ ان کے لئے اس مدرسہ کا وجود ہی

Scanned by CamScanner

سرتاسر زبان سپاس ہے ۔ ہم اللہ تعالیٰ کے شکر گذار ہیں کہ اس نے ہماری قوم کے اندر ایسے اشخاص پیدا کردئے ہیں جو قومی اور مذہبی کاموں میں روپیہ خرچ کرنا، روپیہ کا بہترین مصرف سمجھتے ہیں۔

شیخ سلیمان صاحب نے حال ہی میں پانسو روپے کی گرانقدر رقم مدرسہ کی مرمت کے لئے سو روپے دائرہ کے لئے۔ سو روپے کتبخانہ کے لئے۔ ڈیڑھ سو بمد تعلیم، ڈیڑھ سو بمد زکوٰۃ عنایت فرمائی۔ ان کی فیاضیوں کا کہانتک شکریہ ادا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

دائرہ حمیدیہ کے معاونین میں دو ناموں کا اضافہ ہوا ہے۔

(۱) جناب مایت صاحب، ہڈ ماسٹر اے، وی اسلامیہ ہائی اسکول رنگون۔

(۲) جناب مولوی قمرالزماں صاحب اصلاحی اتالیق و مدرس دینیات ۔۔۔۔۔

یہ دونوں حضرات ہمارا دلی شکریہ قبول فرمائیں۔

مولوی نورالہدیٰ صاحب اصلاحی اور جناب مرزا محمد صدیق صاحب برما کے دورہ سے واپس آگئے۔ ادھر کئی سالوں سے، مالی مشکلات کی وجہ سے، مدرسہ کا وفد سال بسال برما جاتا ہے۔ حالانکہ برما کے کاروباریوں کی حالت کچھ اچھی نہیں رہی ہے لیکن اس کے باوجود ہمدردان مدرسہ نے ہمیشہ حوصلہ اور ہمت کے ساتھ وفود مدرسہ کی پذیرائی کی اور جو کچھ مدد کرسکتے تھے اس سے دریغ نہیں کیا۔ اس سال بھی انھوں نے جو کچھ کیا ہے، ہماری امید سے کم نہیں ہے۔ زیادہ ہی ہے۔ پس ہم برما کے تمام ہمدردوں کے دل سے شکر گذار ہیں۔

حضرات ذیل سے مالی مدد کے علاوہ ہر طرح کی اخلاقی مدد بھی وفد کو حاصل ہوئی اس لئے ہم ان حضرات کے خاص طور پر ممنون ہیں۔

Scanned by CamScanner

(۱) جناب شیخ محمد سلیمان صاحب (۲) مسٹر عبدالرحمٰن صاحب (۳) مسٹر اقبال ولی اعظمی (۴) جناب ولی محمد صاحب (۵) جناب اڈیٹر صاحب مجاہد (۶) جناب اڈیٹر صاحب شیر (۷) جناب حافظ عبدالشکور صاحب (۸) جناب ملا احمد داؤد صاحب مدنی (۹) احمد ابراہیم کمپنی (۱۰) احمد عبدالکریم اینڈ سنس (۱۱) جناب حبیب صاحب (۱۲) جناب منشی عبدالاحد صاحب (۱۳) جناب محمد یعقوب انصاری صاحب (۱۴) ایس اے حسن اینڈ برادرس (۱۵) جناب محمد بشیر خاں صاحب (۱۶) جناب مولوی عبدالشکور صاحب (۱۸) جناب مسٹر انعام اللہ خاں صاحب (۱۸) عبدالغفور برادرس پانڈون (۱۹) جناب محمد یوسف صاحب سنجرپوری (مونگیر) (۲۰) جناب عبداللہ صاحب سنجرپوری (تناچھاؤں) (۲۱) جناب شیخ عبدالحمید صاحب و شیخ محمد عمر صاحب (پالون) (۲۲) جناب بابو فتح علی صاحب رئیس ہنڈ دہ (۲۳) جناب حاجی ظہور احمد صاحب متولی ہندوستانی مسجد (۲۴) جناب حافظ حبیب اللہ صاحب چوکسے (۲۵) جناب حافظ علی حسن صاحب (۲۶) بابو سراج الدین خانصاحب ہنڈ دہ (۲۷) جناب شیخ عبدالرؤف و مقبول احمد صاحبان بسین (۲۸) جناب مصطفےٰ خانصاحب رنگون (۲۹) مرزا محمد عثمان صاحب (کلابستی) رنگون

اگست کے شذرات میں ہم محترم احمد ملا داؤد صاحب مدنی کی عطا کردہ کتابوں کا ذکر کر چکے ہیں۔ ان کتابوں کا بے چینی کے ساتھ انتظار تھا۔ عزیز محترم مولوی نورالہدیٰ سلمہ ان کے صندوق اپنے ساتھ لائے۔ ان کتابوں کو دیکھکر جو روحانی مسرت حاصل ہوئی ہے اس کو الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ ان سے مدنی صاحب کے علمی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے اور یقیناً ان کو اپنے سے جدا کر کے انھوں نے ایثار فی سبیل اللہ کی ایک ایسی مثال قائم کی ہے جو قابل تقلید ہے۔ مدرسۃ الاصلاح کے غریب کتبخانہ اور اسکے اساتذہ و طلبہ پر انکا یہ ایک ایسا احسان ہے جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس اخلاص کا صلہ عطا فرمائے اور دوسروں کو ان کے عمدہ نمونہ کی پیروی کی ہمت بخشے۔

الاصلاح میں اخبارات و رسائل پہ جو ریو یو نکلتے ہیں بعض لوگ ان کے متعلق مراسلات

مکاتبات کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں اور یہ مراسلات موافق و مخالف دونوں قسم کی ہوتی ہیں۔ اڈیٹر کے لئے ان تمام مراسلات کا جواب دینا مشکل ہے اور ان پر رسالہ میں بحث و نظر کا ایک علٰحدہ باب قائم کرنا بالکل ناممکن - ہم کو جو کتابیں ملتی ہیں، سچائی کے ساتھ ان کی نسبت جو ہماری رائے ہوتی ہے، ظاہر کر دیتے ہیں۔ نہ موافقت کے اظہار میں بخیل ہیں نہ مخالفت کے اعلان میں مداہن - اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہی مسلک صحیح ہے۔ اور گو اپنے اس طرز عمل کی وجہ سے بہتوں کو ہم ناخوش کر چکے ہیں جن میں بعض ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کی رفاقت اور دوستی ہم کو نہایت عزیز تھی لیکن ہم کو اس کا کوئی افسوس نہیں ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کرینگے تو منافق ہوں گے جس کے لئے اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

اگر ہر چھوٹی بڑی کتاب کے ریویو کے سلسلہ میں مخالف و موافق بحثیں شروع ہو جائیں اور اڈیٹر کی طرف سے انکا جواب اور رسالہ میں انکی اشاعت بھی ضروری سمجھی جائے تو شاید الاصلاح کے تمام ابواب اسی ایک بحث کیلئے خاص کر دینے ہونگے۔

ہندوستان میں علوم دینیہ کی کس مپرسی کا جو عالم ہے وہ محتاج بیان نہیں، دوسروں کو تو اسکی فکر ہی کب تھی کہ ان سے کوئی شکایت ہو البتہ ہمارے علما اس معاملہ پر کبھی کبھی غور کرتے تھے لیکن اب انھوں نے بھی اس کے مستقبل پر غور کرنا چھوڑ دیا۔ حالانکہ اگر اس وقت یہ سب سے اہم مسئلہ نہیں تو کم از کم ان مسائل میں تو ضرور ہے جن پر ہندوستان کے مسلمانوں کی آئندہ قسمت کا انحصار ہے۔

ہندوستان میں علوم دینیہ کی تحصیل صرف غربا کرتے ہیں، امرا اور عام ارباب استطاعت کو اس سے کوئی تعلق نہیں اور یہ غربا بھی عموماً محض اس وجہ سے اس میں سر کھپاتے ہیں کہ انگریزی تعلیم گراں ہونے کی وجہ سے حاصل نہیں کر سکتے اگر آج اس راہ کی دشواریاں دور ہو جائیں یا کم ہو جائیں تو ہمارا خیال ہے کہ بہت کم لوگ رہجائینگے جنکو عربی تعلیم سے دلچسپی باقی رہجائے۔ اور ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات کو پیش نظر رکھکر کون کہہ سکتا ہے کہ ان دشواریوں کے دور ہونے میں بہت دیر لگے گی۔ پس جن لوگوں کو ہندوستان میں مذہبی تعلیم باقی رکھنی ہے انکو چاہئے کہ اس وقت کے آنے سے پہلے اس معاملہ پر غور کرلیں۔

Scanned by CamScanner

ہم کو اس سچائی سے انکار نہیں ہے کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم عربی مدارس کی تعلیم سے بھی زیادہ بے قیمت ہو گئی ہے۔ معمولی معمولی نوکریوں کے لئے ہزاروں گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ درخواستیں دیتے ہیں اور محروم رہتے ہیں اور اس محرومی نے بہت حد تک لوگوں کے حوصلے پست کر دیئے ہیں۔ تاہم وہ اس محرومی کے اندر بھی ایک امید کی قوت محسوس کرتے ہیں۔ ان کو خیال ہے کہ وہ زندگی کے روزمرہ مسائل میں دوسروں کے مقابل میں زیادہ کامیاب حصہ لے سکتے ہیں اور اپنے تعلیم یافتہ ہونے کی شان باقی رکھ سکتے ہیں لیکن ہمارے عربی مدارس کے طلبا کا عام طور پر یہ حال نہیں ہے۔ ان پر ایک مایوسی اور افسردگی طاری ہے۔ وہ زندگی کے ہر گوشہ میں اجنبیت اور بیگانگی محسوس کرتے ہیں اور خیال کر رہے ہیں کہ وہ جن حالات کے اندر ہیں، ان کے حالات کے مقابلہ کیلئے ان کی تعلیم ان کو مسلح نہیں کر رہی ہے۔ اس چیز کی وجہ سے ان کی ناامیدیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور اگر مذہبی تعلیم کے موجودہ طریقہ میں ضروری تبدیلیاں نہ کی گئیں تو اس کے نتائج اب اچھے نہ ہوں گے۔

معاملہ کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے کہ ہندوستان میں اس وقت ہمارے ارباب حل وعقد وہ لوگ ہیں جو مذہبی تعلیم سے بالکل محروم ہیں۔ حالانکہ یہ منصب اصلاً علما کا تھا۔ مگر علما کی جماعت مختلف وجوہ سے اپنے اس منصب سے محروم ہو کر دوسروں کی پیروی پر مجبور ہو چکی ہے۔ اور ہماری مذہبی تعلیم جس راستہ پر چل رہی ہے اس کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر اب یہ حالت تبدیل نہ ہوگی۔ علما آہستہ آہستہ فکر و عمل کے تمام گوشوں سے نکلتے جائیں گے یہاں تک کہ مذہب اور مذہبی تعلیم کو لوگ ایک غیر مفید چیز سمجھ کر بالکل چھوڑ دینگے۔ حالات کی رفتار جو اب تک رہی ہے وہ بھی کچھ کم افسوسناک نہ تھی لیکن اب نئی تبدیلیاں نہایت خطرناک ہیں۔ اب جو جماعت آگے آگے چلے گی اس کے ہاتھ میں ایک موثر طاقت ہو گی اور یہ طاقت برابر بڑھتی جائے گی پس، اگر ہم نے اپنے تمام امور اس جماعت کے ہاتھ میں دیدیئے تو لامحالہ ہمیں اس بات پر راضی ہونا پڑے گا کہ ہمارے قومی و مذہبی معاملات کو جس رنگ میں یہ جماعت رنگ دے ہم اسی

رنگ کو پسند کریں۔ اور اگر ہم اس بات پر امادہ نہیں ہیں، تو اس خطرہ کے مقابلہ کے لئے تیار رہنا چاہئے اور اسکی شکل صرف ایک ہی ہے کہ ہم مذہبی تعلیم کے موجودہ نظام میں ایسی تبدیلی کریں کہ اس سے ایسے علمار تیار ہوں جو ہماری دینی و دنیاوی زندگی کے ہر گوشہ میں رہنمائی کر سکیں۔

یہ کام ہے نہایت مشکل عربی درسگاہیں اس درجہ کس مپرسی کے عالم میں ہیں کہ کوئی موثر اور اہم تبدیلی کرنا ان کو پہاڑ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اب اس کام کو کئے بغیر چارہ نہیں۔ یا تو تبدیلی کیجئے، یا علوم دینیہ کی رہی سہی یادگاروں کی آخری سانسیں گننے کے لئے تیار ہو جایئے۔

ہندوستان کی تحریک آزادی میں شرکت کرنے سے جو لوگ جھجک رہے ہیں، ان کے خدشات عجیب عجیب ہیں۔ منجملہ بہت سے موانع کے ایک بہت بڑا مانع یہ ہے کہ اس تحریک کے پورے نظام پر ہندو تہذیب و معاشرت کا رنگ غالب ہے۔ اس میں اسلامی تہذیب و تمدن کی شان نہیں ہے۔ ہم کو اس واقعہ سے انکار نہیں ہے۔ لیکن غور کرنا چاہئے کہ ایسا کیوں ہے؟ ہمارے خیال میں اب تک اس تحریک کا تمام نظام عملاً ہندوؤں کے ہاتھ میں رہا ہے۔ مسلمانوں نے یا تو اس میں شرکت نہیں کی یا شرکت کی تو اس طرح کہ آندھی کی طرح آئے اور طوفان کی طرح گذر گئے۔ ایسی حالت میں اگر اس کے تمام نظام پر ہندو تہذیب و تمدن اور ہندو رسوم و عوائد کا رنگ غالب ہو تو کیا تعجب ہے۔ فرض کیجئے، صورت حالات اس کے برعکس ہوتی۔ یعنی کانگریس کی تاریخ بناسے آج تک اس کے اصلی کرتا دھرتا مسلمان ہی رہے ہوتے اور ہندوؤں کی شرکت اس میں اسی طرح ہوتی جس طرح آج مسلمانوں کی شرکت ہے تو کیا کانگریس کے پورے نظام کے کسی گوشہ میں وہ ہندو تہذیب و تمدن کا کوئی نقش قائم ہونے دیتے؟ پس ہمارے نزدیک یہ اعتراض بالکل بیجا ہے۔ مسلمانوں کو کانگریس میں جوق جوق شریک ہونا چاہئے، اس کے تمام کاموں کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے اور اخلاص، جوش عمل اور جذبۂ قربانی

ہے اس کے تمام نظام پر حاوی ہو جانا چاہئے اس کے بعد وہ دیکھیں کہ ان کا رنگ کتنا شوخ ہے اور ہر چیز پر کتنی تیزی سے چڑھتا ہے صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً۔

ہم کو اتفاق اور اختلاف کے اصول بھی طے کر لینے چاہئیں۔ جہاں تک تحریک آزادی کا تعلق ہے ہندوؤں اور دوسری پڑوسی قوموں سے ہمارے اتحاد کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہندوستان سے برطانوی اقتدار اٹھ جائے۔ بس اسی معاملہ میں ہمارا انکا سمجھوتہ ہے۔ اس مقصد کیلئے وہ جو کچھ کریں گے اسمیں ہم انکے ساتھ شرکت عمل کرینگے۔ باقی امور میں وہ اور ہم دونوں آزاد ہیں اور چاہئے کہ جملہ معاملات میں تمام اختلافات رکھنے کے باوجود اس مقصد میں متحد رہیں۔ ہاں اگر وہ کوئی بات اس مقصد کے خلاف کریں تو پھر ہمارا اور انکا اتحاد باقی نہ رہنا چاہئے لیکن اس کے علاوہ دوسرے معاملات میں وہ جو روش بھی اختیار کریں یا ہم جو راہ بھی چلیں اس کا اثر اس مشترک مقصد پر ہرگز نہیں پڑنا چاہئے۔ یہ بڑی سخت غلطی ہے کہ ہم اس مقصد میں متحد ہونے کیلئے زندگی اور معیشت کے تمام گوشوں اور مذہب و اعتقاد کے تمام معاملات میں متحد ہونا ضروری سمجھتے ہیں اور جہاں کہیں فریقین میں سے کسی کی طرف سے کوئی بات دوسرے کے مذہب و معاشرت کے خلاف ہوئی بس پھر تمام رشتوں پر مقراض چل گئی اور باہمی اتحاد ناممکن ہو گیا۔ ہمارے نزدیک ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو اس معاملہ پر یک مرتبہ جم کر غور کر لینا چاہئے۔

عام مذہبی و معاشرتی معاملات کے علاوہ ہم کو اپنی پڑوسی قوموں کی نیت کے متعلق بھی اپنا مسلک متعین رکھنا چاہئے یعنی یہ کہ اگر وہ ہم کو تباہ کر سکیں گی تو یقیناً ہماری پرورش نہیں کریں گی ممکن ہے معاملہ اسکے خلاف ہو لیکن ہم کو اپنے پیش نظر یہی بات رکھنی چاہئے پھر سوچنا چاہئے کہ موجودہ امن بہتر ہے یا وہ بے اطمینانی۔ اور جو بہتر نظر آئے اس کو مضبوط دل سے اختیار کر لینا چاہئے

Scanned by CamScanner

معارف قرآن

تفسیر سورہ عبس

(۱)

تالیف :- استاذ امام علامہ حمید الدین فراہیؒ

ترجمہ :- امین احسن اصلاحی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَبَسَ وَتَوَلّٰى (۱) اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى (۲) وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰى (۳)
اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى (۴) اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى (۵) فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى (۶)
وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزَّكّٰى (۷) وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى (۸) وَهُوَ يَخْشٰى (۹) فَاَنْتَ
عَنْهُ تَلَهّٰى (۱۰)

اس نے تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا (۱) اس پر کہ ایک اندھا اس کے پاس آیا (۲) اور تجھے کیا معلوم، شاید وہ سدھرنا چاہتا ہو (۳) یا دھیان کرنا چاہتا ہو تو اسے یاد دلانا مفید ہوتا (۴) جو بے پروائی کرتا ہے (۵) اس کے تو، تو پیچھے پڑا ہے (۶) حالانکہ تجھ پر کچھ الزام نہیں اگر وہ پاکیزہ بننا نہیں چاہتا (۷) اور جو تیرے پاس دوڑ کر آتا ہے (۸) ڈرتا ہوا (۹) اس سے تو تغافل کرتا ہے (۱۰)

سورہ کا عمود، موقع اور ما قبل سے تعلق

۱۔ یہ سورہ منذرات میں سے ہے، یعنی ان سورتوں میں سے جو قوم کے لئے تہدید و وعید کی سرزنش لیکر نازل ہوئی ہیں۔ اور ابتدائے بعثت و دعوت کی اکثر سورتوں کا یہی حال ہے۔ البتہ ان کے اسلوب بیان مختلف ہوگئے ہیں۔ مثلاً اسی سورہ میں انذار کا پہلو یوں اختیار کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلعم کو ان لوگوں کے پیچھے وقت ضائع کرنے سے روکا گیا ہے جو انکار اور نافرمانی پر اڑے ہوئے ہیں اور کسی طرح اپنی جگہ چھوڑنا نہیں چاہتے۔ پھر اسی مضمون سے متعلق آگے چلکر بعض اور باتیں آگئی ہیں۔ مثلاً چند لفظوں میں ان منکرین کی ہٹ دھرمی پر زجر و توبیخ ہے، پھر ان کی ضد اور بے پروائی کی خرابی کے دلائل ہیں، پھر ان کے انجام کار کی تفصیل ہے اور آخر میں مقابلہ کے اصول پر ان لوگوں کا بھی ذکر آگیا ہے جنھوں نے، ان سے الگ ہوکر ایمان و اطاعت کی راہ اختیار کی ہے۔ اور اس کے چند فوائد ہیں۔ مثلاً

(۱) توضیح مطلب کے لئے مخالف پہلو کا ذکر مفید ہوتا ہے۔ وبضدھا تتبین الاشیاء

(۲) اس میں ترہیب کے ساتھ ترغیب کا پہلو بھی پیدا ہو گیا ہے جو ایک جامع اور موثر انداز کلام ہے۔

(۳) اس میں آنحضرت صلعم کو اشارہ ہے کہ آپ کی توجہ کے اصلی مستحق مومنین ہیں، انکا حق مقدم ہے۔

سابق سورہ سے اس کا ربط یوں ہے کہ اس کے خاتمہ کی آیت "انما انت منذر من یخشاہا" ہے۔ یعنی تمھاری نصیحتوں کو وہی قبول کر سکتے ہیں جو قیامت سے ڈرتے ہیں۔ پس اس سورہ میں یہ بتا دیا کہ تم ان لوگوں سے اصرار و الحاح پر مامور نہیں کئے گئے ہو جو قیامت کے خوف سے بے پروا ہیں۔ اور یہ مضمون قرآن مجید میں بار بار دھرایا گیا ہے اور اس کے تکرار کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نہایت رافت و شفقت کی وجہ سے یا فرط جوش تبلیغ و دعوت میں کبھی کبھی اصرار و الحاح کی راہ اختیار کر لیتے تھے۔ یہاں بھی وہی مضمون ہے۔ اور قرآن مجید نے اپنے عام اصول کے مطابق تعلیم کو موثر اور

دلنشین بنانے کے لئے نابینا کے مناسب حال واقعہ کو بطور مثال اختیار کر لیا ہے اور پیغمبر صلعم کو تبلیغ و دعوت میں اصرار کی اس حد سے روکا ہے جو آپ کے منصب کے شایان شان نہیں ہے۔ اور گو کلام کا ظاہر اسلوب تنبیہ و عتاب کا ہے لیکن درحقیقت ان تمام مواقع میں جہاں آنحضرت صلعم کو منکرین سے اعراض کا حکم دیا جاتا ہے، غصہ و عتاب کا اصلی رخ پیغمبر صلعم کے بجائے منکرین کی طرف ہوتا ہے۔ اور یہ تمام دعوتوں کا ایک نہایت معروف اسلوب ہے جس سے اہل نظر ناواقف نہیں ہیں۔

سورہ کی یہ تاویل جو بالاجمال، ہم نے اوپر بیان کی ہے، بالکل واضح ہے اور کسی صاحب بصیرت کو اس کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی لیکن بعض مفسرین سے اس کی تاویل میں لغزش ہو گئی ہے جس کو ہم آگے بیان کریں گے اور اس کا مقتضیٰ ہے کہ پہلے ہم ایک فصل میں انبیاء کے خلق عظیم پر روشنی ڈالیں اور یہ واضح کر دیں کہ کبھی کبھی جو ان کو عتاب کے اسلوب پر مخاطب کیا جاتا ہے، تو اس عتاب کا اصلی پہلو کیا ہوتا ہے۔

انبیاء کا خلق عظیم، ان کی عصمت اور انکے مواقع عتاب

۲۔ عقل و نقل کے تمام پہلوؤں سے یہ بحث طے پا چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ فرض رسالت کی ادائگی کے لئے انہی لوگوں کو چنا جو اس کی مخلوق میں اخلاق و تقویٰ کے نقطۂ کمال پر تھے۔ چنانچہ فرمایا ہے "واللہ یعلم حیث یجعل رسالتہ"۔ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت کا بوجھ کن پر ڈالے۔ اور حضرت سرور کائنات کی نسبت فرمایا کہ "وانک لعلی خلق عظیم" بے شک تم ایک خلق عظیم پر ہو۔ اس مضمون کی توضیح صحیحین کی ایک روایت سے بھی ہوتی ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے، کہ آنحضرت صلعم کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا اور بقیہ تمام مخلوق کو دوسرے پلڑے میں، جب آپ تمام مخلوق پر بھاری ثابت ہوئے تب آپ کا انتخاب بار رسالت کی ذمہ داریوں کے لئے عمل میں آیا۔

اس برگزیدگی کے بعد اللہ تعالیٰ ان کی تربیت فرماتا ہے، ان کو اپنے امر و نہی سے مطلع کرتا ہے، اور جن چیزوں سے وہ ناواقف ہوتے ہیں ان کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ہر لمحہ اس کے اشاروں پر چلتے ہیں اور اس کی نگاہوں میں رہتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا ہے۔ "فانک باعیننا" پس بیشک تو ہماری نگاہوں میں ہے۔

دوسرے مقام پر فرمایا۔

فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ	پس وہ ان کے آگے اور پیچھے پہرہ رکھتا ہے تاکہ وہ دیکھ
رَصَدًا لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ	لے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیئے اور ان کے
رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَاَحْصٰى	سارے معاملات اس کے احاطہ میں ہیں اور اس نے
كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا۔	ہر چیز کو شمار کر رکھا ہے۔

یعنی عالم غیب کی ایک مخصوص نگاہ انبیاء کرام کی نگرانی کرتی ہے۔ ان کو کبھی کسی لغزش میں پڑنے نہیں دیتی۔ قبل اس کے کہ ان کے قدم کسی خطرہ کے مقام پر پہنچیں، خدا کا ہاتھ ان کی رہنمائی کے لئے نمودار ہو جاتا ہے۔ اور اگر کبھی وہ کسی پرخطر راہ میں نکل جاتے ہیں تو صرف اتنی دیر تک کے لئے ان کو وہاں چھوڑا جاتا ہے کہ وہ اپنے فرض نبوت اور منصب دعوت و تبلیغ کی ذمہ داریوں کو ادا کریں، اس سے زیادہ ان کو وہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی جاتی اور یہ بھی اس لئے کہ ایسا ہونا سنت الٰہیہ اور قانون حکمت کا اقتضاء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے آزمائش کا قانون رکھا ہے۔ اور یہی قانون ان کے باطن کی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔

پس جب کبھی اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ اس کے رسول کے قدم کسی ویسی جگہ پہنچ گئے ہیں جہاں لغزش کا اندیشہ ہے، وہ فوراً اس کو متنبہ کر دیتا ہے۔ اور اگر وہ پورے جوش انہماک میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے تو بعض اوقات نہایت کھلے لفظوں میں بلکہ بانداز عتاب اس کو آگے بڑھنے سے روک دیتا ہے تاکہ وہ متنبہ ہو جائے اور جس چیز سے منع کیا جا رہا ہے اس کی اصلی اہمیت اس کے سامنے بے نقاب ہو جائے۔

Scanned by CamScanner

پیغمبر اس وقت چونک جاتا ہے اور سامنے کے خطرہ کو دیکھکر سوچتا ہے کہ اگر خدا کے غیر مرئی ہاتھ نے نمودار ہوکر رہنمائی نہ کردی ہوتی تو وہ تو بالکل مزلہ قدم کے قریب پہنچ چکا تھا! یہ چیز اس کے شکر و انابت کے جذبہ میں ایک جوش پیدا کرتی ہے اور تذلل وخضوع کی تمام نیازمندیوں کے ساتھ وہ اپنے خدا کے سامنے گر پڑتا ہے اور اس سے قریب تر ہوجاتا ہے، بالکل اسی طرح جس طرح ماں جب بچے کو ڈرادیتی ہو تو وہ اس کے سینے سے اور چمٹ جاتا ہے۔

الغرض پیغمبر کا رجحان ہر حالت میں بھلائی ہی کی طرف ہوتا ہے۔ اس کا دل ہوا و ہوس کی آلودگیوں سے بالکل پاک ہوتا ہے اس کا جو قدم بھی اٹھتا ہے مرضات الٰہی کی راہ میں اٹھتا ہے۔ البتہ اسی میں کبھی کبھی وہ افراط کی راہ اختیار کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو حق و اعتدال کی بیچ راہ پر لاکر کھڑا کردیتا ہے، کیونکہ پیغمبر اپنی قوم کے لئے نمونہ ہوتا ہے۔ اس کی ہر چھوٹی بڑی بات پیروی اور اقتدا کے لئے ہوتی ہو۔ پس اس کے کسی فعل میں اگر افراط کا ادنیٰ شائبہ بھی پایا گیا تو اس سے تمام امت کی راہ کج ہوجائیگی۔

اس افراط کا سبب یہ ہے کہ وہ انسانوں کے باطن سے بے خبر ہوتے ہیں۔ باطن کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ اس لئے کبھی کسی شخص کی اصلاح سے مایوس نہیں ہوتے۔ کوئی شخص انکار و سرکشی کی کتنی ہی سخت و شدید حالت اختیار کرلے لیکن وہ ایک غمگسار دوست اور ایک ہمدرد طبیب کی طرح لگے رہتے ہیں اور جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ظاہر نہ کردیا جائے کہ فلاں شخص اللہ کا دشمن ہے، ایمان نہ لائے گا، وہ اس کے ایمان و ہدایت سے مایوس نہیں ہوتے۔ البتہ جب اللہ تعالےٰ اعلان کردیتا ہے کہ فلاں شخص اللہ کا دشمن ہے، اس پر ایمان و ہدایت کی راہ باز نہ ہوگی، اس سے علیحدگی اختیار کرلو، تو اس سے برأت کا اعلان کردیتے ہیں۔ اس معاملہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ قرآن مجید نے متعدد مقامات میں بیان کیا ہے۔

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِلَّهِ   پس جب اس پر یہ بات کھل گئی کہ وہ اللہ کا

تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ دشمن ہے وہ اس سے علیحدہ ہوگیا۔ بیشک

لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ابراہیم بہت ہی دردمند اور بردبار تھا۔

کبھی کبھی اس کے برعکس حالت بھی پیش آتی ہے یعنی پیغمبر کسی جماعت کی سرکشی اور اس کے تمرد کو دیکھکر ان کے ایمان وہدایت کی طرف سے بالکل مایوس ہوجاتا ہے۔ حالانکہ وہ جماعت ابھی اس حد کو نہیں پہنچی ہوتی کہ اس سے مایوسی کا اعلان کردیا جائے۔ اس کے جینے اور پنپنے کی ایک ہلکی سی امید باقی ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں اس کی مثال حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ ہے۔ اس طرح کے واقعات پیش آنے کی وجہ یہی ہے کہ پیغمبر دلوں کے حال سے ناواقف ہوتا ہے۔ وہ ظاہر کو دیکھکر ایک فیصلہ کرتا ہے۔ حالانکہ اس طرح کے معاملات میں فیصلہ کا انحصار باطن کی حالت پر ہے۔ پس اس معاملہ میں صرف علام الغیوب ہی کا فیصلہ، فیصلہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ بسا اوقات وہ کسی جماعت سے اعراض کا حکم دیدیتا ہے کیونکہ اس نے دیکھ لیا کہ اب یہ جماعت ایمان نہیں لانے کی اور بعض اوقات پیغمبر کو کسی مخصوص جماعت کے ساتھ صبر وثبات اور مجاہدہ وریاضت کا حکم دیتا ہے کیونکہ ابھی اس کے اندر امید کی ایک ہلکی سی کرن باقی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ پیغمبر کی باگ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہ کبھی اس کو اگے بڑھاتا ہے، کبھی روک لیتا ہے۔ اور یہ دونوں باتیں کسی خاص اصول حکمت پر مبنی ہوتی ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ خدا کی نعمت ایسے لوگوں پر پیش کرتا ہے جو کسی طرح اس کے مستحق نہیں ہوتے، ایسے مواقع پر اس کو اعراض کا حکم دیا جاتا ہے۔ اور اس کو فرط جوش ودعوت پر پُر محبت عتاب ہوتا ہے۔ اور کبھی یوں ہوتا ہے کہ کسی قوم کی سرکشی ونافرمانی سے اس کو غیرت حق لاحق ہوتی ہے اور وہ ان سے بیزار ہوکر علیحدہ ہوجانا چاہتا ہے ایسے مواقع پر اس کو پُر عتاب حکم ہوتا ہے کہ ان کے اندر تبلیغ ودعوت کا جہاد جاری رکھے اور جب تک حکم خداوندی نہ ہو وہ حق کو کتنی ہی بیدردی کے ساتھ ٹھکرائیں، لیکن وہ صبر وضبط کو

Scanned by CamScanner

ہاتھ سے نہ دے۔ غرض کبھی اس کے کمال رحمت و شفقت پر عتاب ہوتا ہے اور کبھی کمال غیرت حق پر۔ اور یہ دونوں حالتیں ایسی ہیں جو نفس کی آلائشوں سے پاک ہیں۔

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

۔[عبس] منہ بنایا، تیوری چڑھائی، ترشرو ہوا۔ اس کی مزید تشریح تولی نے کردی۔ تولی یعنی اعراض کیا۔

[ان جاءہ] اصل میں "لان جاءہ" ہے۔ یہ ترشرو ہونے کا سبب بیان ہوا کہ در اصل ترشروئی کا باعث اس وقت نابینا کا آنا تھا، نہ کہ اس کی ذات۔ مزید تفصیل آگے آئے گی۔

[الاعمیٰ] نابینا۔ اس بات پر سب متفق ہیں کہ اس سے مراد یہاں ابن ام مکتومؓ ہیں۔ انکا نام بھی لیا جاسکتا تھا۔ لیکن اس صفت کے ساتھ ذکر کرنے سے ایک طرف تو ان کے ضعف و احتیاج کی حالت ظاہر ہوگئی، دوسری طرف یہ معلوم ہوا کہ وہ آنحضرت صلعم کی اس وقت کی مشغولیت سے بالکل لاعلم تھے۔ پس مقتضائے حال کی بے شمار بلاغتیں اس لفظ کے اندر پنہاں ہیں۔

[ومایدریک لعلہ یزکی] مایدریک کا مفعول یہاں محذوف ہے۔ اس کا قائم مقام لعلہ یزکیٰ ہے۔ یہ حسب قاعدہ مقابلہ مفعول محذوف کا خود پتہ دے رہا ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے:۔

"ومایدریک لعل الساعۃ قریب" یعنی تمھیں کیا خبر کہ قیامت بہت دور ہے۔ شاید وہ قریب آگئی ہو۔ دیکھو لعل الساعۃ قریب کے ٹکڑے نے اصل مفعول کی طرف خود انگلی اٹھا دی کیونکہ جملہ کی نوعیت مقتضی ہے کہ اس کا ایک مقابل یہاں محذوف مانا جائے۔ پس آیت کی تاویل یہ ہوگی کہ تمھیں کیا معلوم کہ اس کا آنا مدہار اور دھیان کے لئے نہیں ہے کہ تم کفار کے طعنہ کی شرم میں پڑ گئے کہ وہ کہیں گے "محمدؐ کے پیرو اندھے اور عاجز لوگ ہیں، جو بیوقوفی اور طمع کی وجہ سے ان کی باتوں میں آگئے ہیں، پس ہم انکی پیروی کرکے ایسوں کی رفاقت کا ننگ کیسے گوارا کرسکتے ہیں۔"

Scanned by CamScanner

اس سے صاف واضح ہے کہ آنحضرت صلعم کو بالکل نہیں معلوم تھا کہ ابن ام مکتوم اسوقت تعلیم و تزکیہ کا کوئی مقصد لے کر آئے ہیں۔ آپ کو جو چیز ناگوار ہوئی وہ محض ان کا اسوقت کا آنا تھا اور اس کا باعث وہی خیال تھا جو اوپر بیان ہوا۔ باقی رہی یہ بات کہ ابن ام مکتوم نے آنحضرت صلعم سے تعلیم قرآن کی درخواست کی اور آپ نے اعراض فرمایا تو یہ بات از روئے روایت بھی ثابت نہیں۔ اور از روئے قرآن اسکے ضعف کا جو حال ہے وہ نمایاں ہے۔ مزید تفصیل آگے آئے گی۔

[یزکی] سدھرنا چاہتا ہو ——— یعنی آنحضرت صلعم کی صحبت اور آپ کی دعا کی برکت سے۔

[یذکر] دھیان کرنا چاہتا ہو ——— یعنی قرآن سے اور پیغمبر کی نصیحتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو۔

[استغنیٰ] بے پروا ہوا ——— یعنی تزکیہ و تذکرہ اور انابت و خشیت سے۔ ان چیزوں کا ذکر اس لئے حذف کر دیا کہ ماقبل و مابعد کا تقابل اس پر دال تھا۔

[تصدیٰ] دراصل تتصدی تھا۔ یہ صدد سے ہے جس کے معنی متوازی اور متقابل کے ہیں۔ عام بول چال میں کہتے ہیں۔ داری بصدد دارہ۔ پس تصدی کے معنی ہوئے تعرض کرنیکے۔ یہ تولی کا ضد ہوا۔

[وما علیک الا یزکی] یعنی اگر وہ سدھرنا نہ چاہے تو اس کا بار الزام تم پر نہیں۔

[یسعیٰ] وہ دوڑ کر آتا ہے ——— لیکن اس دوڑ کر آنے سے وہ دوڑنا مراد نہیں ہے جو پاؤں سے ہوتا ہے۔ یہ دل کے بیتابانہ شوق کے لئے ایک پرکنایہ طریقہ تعبیر ہے۔ موقع کلام اس پر دال ہے۔ نیز یخشیٰ سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے۔

[یخشیٰ] ڈرتا ہے ——— بظاہر ایک جامع اور مطلق لفظ ہے لیکن خوف قیامت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ سابق سورہ میں بالکل واضح کر دیا ہے۔ انما انت منذر من یخشاہا۔ تم تو بس انہی کو ڈرانیوالے ہو جو قیامت سے خوف کھاتے ہیں۔

[تلہّیٰ] دراصل تتلہی ہے۔ ——— تلہی عنہ کے معنی ہیں اس سے غافل ہو گیا۔ الہانی عنہ ذٰلک کے

Scanned by CamScanner

معنی ہوئے۔ مجھے فلاں چیز نے اس سے پھیر دیا اور میں اس کی طرف توجہ نہ کرسکا۔ عقبہ بن بجیر کا شعر ہے۔

طافی ساف الضیف والبیت بیتہ ولم یلھنی عنہ غزال مقنع

میرے دروازہ پر اگر کوئی مہمان اتر پڑتا ہے تو میرا اوڑھنا بچھونا مہمان کا اوڑھنا بچھونا اور میرا گھر مہمان کا گھر بن جاتا ہے اور کوئی برقعہ پوش ہرنی مجھے اس سے غافل نہیں کرتی۔

ان آیات کا موقع نزول اور واقعہ کی اصلی تصویر

۴۔ یہ آیتیں اس موقع پر نازل ہوئی ہیں جب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ آنحضرتؐ منکرین کے پیچھے وقت نہ ضائع کریں اور اپنی تمام توجہ اور سرگرمی کا مرکز مسلمانوں کو بنائیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ابتدا میں آنحضرت صلعم کو یہ حکم ہوا تھا کہ آپ سب سے پہلے اپنی قوم کے ان سرداروں کو دین حق کی دعوت دیں جو قوم میں دینی پیشوائی کے منصب پر متمکن ہیں اور ساتھ ہی آپ کو یہ ہدایت بھی کردی گئی تھی کہ اگر یہ لوگ اعراض کریں اور کفر و انکار پر جم جائیں تو بالآخر آپ ان کو چھوڑ کر صرف مسلمانوں کے ساتھ مشغول ہو جائیں اور اپنا سارا وقت انہی کی تعلیم و تربیت پر صرف فرمائیں۔ بعض ابتدائی آیات میں اس معاملہ کے تمام مراحل کی پوری تفصیل کردی گئی تھی۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۙ	اور اپنے قریب کے رشتہ داروں کو خدا کے عذاب سے ڈراؤ
وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ	اور جن مومنین نے تمھاری پیروی کی ہے ان پر
مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ فَاِنْ عَصَوْكَ	شفقت کرو، پس اگر (تمھارے رشتہ دار) تمھاری
فَقُلْ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ۚ وَ	بات نہ مانیں تو تم کہہ دو کہ میں تمھارے فعل سے بری
تَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ الَّذِيْ	ہوں اور خدائے عزیز و رحیم پر بھروسہ کرو۔ جو تم کو دیکھتا
يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ وَتَقَلُّبَكَ	ہے جب تم اٹھتے ہو اور دیکھتا ہے (نماز میں)

فِي السّٰجِدِيْنَ تمھاری آمد و شد کو۔

اس ہدایت کے بموجب آنحضرت صلعم تبلیغ و دعوت میں مشغول ہوئے۔ لیکن قوم کی طرف سے آپ کی دعوت کا جواب تکبر اور گھمنڈ کے انکار کے ساتھ دیا گیا۔ تاہم آپ بد دل نہ ہوئے، محبت کے جوش اور دعوت حق کی سرگرمی میں، اعراض و انکار کی ان تمام سختیوں کو جھیلتے رہے۔ آپ کو توقع تھی کہ یہ بیگانگی عارضی ہے۔ جلد وہ وقت آجائے گا کہ یہ لوگ آپ کی نصیحتیں قبول کرلیں گے۔ چنانچہ عناد و مخالفت کے ہیجان میں وہ لوگ جتنے ہی آپ سے دور ہٹتے جاتے آپ محبت و رافت کے جوش میں اسی قدر ان سے قریب ہوتے جاتے۔ اور اس کے چند اسباب تھے۔

اولاً محبت و شفقت کا وہ بے پایاں جذبہ جو رحمۃ للعالمین کے ساتھ مخصوص تھا، اور جس نے آپ کی نگاہوں میں دشمنوں کو عزیزوں سے زیادہ محبوب بنا دیا تھا۔

ثانیاً۔ سالت عظمیٰ کے فرائض کی ذمہ داریوں کا احساس۔

ثالثاً یہ خیال کہ طاقتوروں اور دولتمندوں کا ایمان دین حق کی تائید و تقویت کا باعث ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہم اور بعض دوسرے سابقون الاولون کے ذریعہ آپ کے اس خیال کی تصدیق فرمادی۔

رابعاً یہ اندیشہ کہ مبادا ادائے فرض کی راہ میں جو صبر و جہاد مطلوب ہے، اس میں کسی طرح کی کوتاہی ہوجائے۔

یہ سب باتیں اپنی جگہ پر بالکل صحیح تھیں۔ رافت و رحمت کے بے پایاں جذبہ اور ادائے فرض کے حقیقی جوش کا تقاضا یہی تھا کہ آنحضرت صلعم ایسا ہی کریں لیکن اس معاملہ کے بعض پہلو ایسے تھے جو مقام نبوت کے شایان شان نہ تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس سے روک دیا۔ اولاً تو اس میں ان لوگوں کے حقوق سے تھوڑی سی بے پروائی ہوجاتی جو آپ کی توجہ کے اصلی مستحق تھے یعنی مومنین خاصین

ثانیاً اس سے نبوت کے اس وقار کو ٹھیس لگتی جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے صرف سربلندی اور برتری ہی پسند کی ہے ۔ پستی اور جھکاؤ کبھی نہیں چاہا ہے ۔

اسی وجہ سے قرآن مجید میں آپ کو متعدد مقامات میں صرف مومنین صالحین کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو جانے کا حکم دیا گیا ، منکرین کے پیچھے وقت ضائع کرنے ، اور ان پر غم کھانے سے روکا گیا ۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ	پس شاید تم ان لوگوں کے پیچھے مارے غم کے اپنی
اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا (کہف ۶)	جان ہلاک کر ڈالو گے اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں گے ۔
وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ	اور (اے پیغمبر) اپنے آپ کو ثابت قدم رکھو ان لوگوں
رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ	کے ساتھ جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں
وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ	اس کی رضا طلبی میں اور دنیاوی زندگی کی زینت
تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَلَا	کی کھوج میں تمہاری نگاہیں ان سے ہٹنے نہ پائیں
تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا	اور تم ان لوگوں کی بات پر کان نہ دھرو جن کے
وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا	دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیئے ہیں اور جنھوں
وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ	نے اپنی خواہشوں کی پیروی کی ہے اور جن کا معاملہ حد سے
فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ	بڑھ گیا ہے کہدو کہ حق تمہارے پروردگار کی جانب سے ہے
(کہف ۲۸ - ۲۹)	پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کرے
فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ (الذاریات ۵۴)	پس تم ان سے اعراض کرو ، تم کو کوئی ملامت نہیں ہے ۔

ان آیات سے واضح ہے کہ جب کبھی ایسا ہوا کہ جوش تبلیغ و دعوت میں آنحضرت صلعم نے انہماک و سرگرمی کی وہ حالت اختیار کرلی جو حد اعتدال سے کچھ متجاوز ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو روک کر صحیح جادۂ اعتدال پر لگا کر دیا ۔ انھی حالات کے اندر اتفاق سے یہ ابن ام مکتومؓ والا واقعہ پیش آگیا ۔ وحی الٰہی تعلیم و تربیت کیلئے

Scanned by CamScanner

مناسب حال واقعات کی منتظر ہی رہتی تھی۔ پس یہ واقعہ ایک ایسی سورہ کے نزول کا باعث بن گیا جو اغنیاء کی زجر و توبیخ، غریبوں کی مدح و ستائش اور دل شکستوں کی دلداری و ہمدردی پر ایک بلیغ ترین خطبہ اور جامع ترین موعظت ہے۔ اور آنحضرت صلعم تبلیغ و دعوت میں کبھی کبھی جو اصرار و الحاح کی شکل اختیار کر لیتے تھے، اس میں اُن کی بھی نہایت واضح لفظوں میں تنبیہ ہو گئی کہ آپ منکرین کے پیچھے اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ صرف مومنین کی اصلاح و تربیت میں لگیں جو آپ کی شفقتوں کے اصلی مستحق ہیں۔

واقعہ کی اصلی صورت یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کے پاس سادات قریش بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ ان کو تبلیغ و دعوت فرما رہے تھے۔ اسی بیچ میں ابن ام مکتوم آ گئے۔ آنحضرت صلعم کو اندیشہ ہوا کہ اب یہ بدک جائیں گے۔ اور کہیں گے کہ تم نے چند اندھوں اور غریبوں کو طمع دلا کر اور بیوقوف بنا کر پھنسا رکھا ہے اور اب ہمارے لئے دام بچھاتے ہو، تو ہم تو اس وقت تک تمھارے پیرو نہیں ہونے کے جب تک تم ان کو اپنی پیروی سے خارج نہ کرو، ہم اشراف ہو کر ان اراذل کی سطح پر نہیں اتر سکتے۔

آنحضرت صلعم کا یہ اندیشہ بالکل بجا تھا۔ سادات قریش اس خیال کو بار بار ظاہر کر چکے تھے۔ قرآن مجید نے کئی جگہ اس کا حوالہ دیا ہے۔

قَالُوٓا اَنُؤۡمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ	جواب دیتے ہیں کیا ہم ایمان لائیں جس طرح
(بقرہ ۱۳)	یہ بیوقوف ایمان لائے ہیں۔

دوسرے مقام پر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

وَاَنۡذِرۡ بِهِ الَّذِيۡنَ يَخَافُوۡنَ اَنۡ	اور اس کے ذریعہ ان لوگوں کو ہوشیار کر دو جو
يُّحۡشَرُوۡٓا اِلٰى رَبِّهِمۡ لَيۡسَ لَهُمۡ	ڈرتے ہیں کہ اپنے رب کے پاس جمع کئے جائیں گے
مِّنۡ دُوۡنِهٖ وَلِىٌّ وَّلَا شَفِيۡعٌ لَّعَلَّهُمۡ	اور اس وقت خدا کے سوا ان کا کوئی دوست
يَتَّقُوۡنَ وَلَا تَطۡرُدِ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ	ہو گا اور نہ سفارشی۔ تاکہ وہ پرہیزگاری اختیار کریں

رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ
وَجْهَهٗ، مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ
مِنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ
مِنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ
الظّٰلِمِيْنَ۔ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ
بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ
اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْ بَيْنِنَا۔ اَلَيْسَ
اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ۔ وَاِذَا
جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا
فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ
عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ۔ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ
مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ
مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ

(۵۱ - ۵۴ الانعام)

اور نہ دھتکارو ان لوگوں کو جو صبح وشام اپنے
رب کو پکارتے ہیں اسکی رضا جوئی ہیں۔ تم پر انکی
جواب دہی کچھ نہیں ہے اور نہ تمھاری جواب دہی
کچھ ان پر ہے کہ تم ان کو دھتکار کر ظالموں میں
بن جاؤ۔ اور اسی طرح ہم نے بعض کو بعض سے
آزمایا ہے تاکہ وہ کہیں کیا یہی لوگ ہیں جن پر
اللہ نے ہم میں سے فضل کیا ہے۔ کیا اللہ شکرگذ
بندوں کو نہیں جانتا۔ اور جب تمھارے پاس آئیں
وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہیں ہماری آیتوں پر
تو کہو تم پر سلامتی ہو۔ تمھارے پروردگار نے اپنے
اوپر رحمت واجب کر لی ہے کہ جو کوئی تم میں سے
براہ نادانی کوئی برائی کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ
کرے اور اپنی حالت کی اصلاح کر لے تو بے شک
وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ
الْمُشْرِكِيْنَ۔ اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ
الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا
اٰخَرَ، فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ۔ وَلَقَدْ
نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ

پس تم کو جس بات کا حکم ملا ہے، کھول کر سنا دو
اور مشرکوں سے منہ پھیر لو۔ اور مذاق اڑانیوالوں
کے لئے، جو اللہ کا ساجھی ٹھہراتے ہیں ہم تمھاری
طرف سے بس ہیں۔ پس عنقریب ان کو معلوم ہو جائیگا
اور ہم کو معلوم ہے کہ تم ان کی باتوں سے

Scanned by CamScanner

بِمَا یَتَوَلُّوْنَ (۹۴-۹۷ الحجر) دل تنگ ہوتے ہو۔

آنحضرت صلعم اپنی رافت و رحمت کی وجہ سے تمام غربا، و مساکین کے ملجا و ماویٰ تھے، اور بوجہ شدت غیرت یہ کبھی نہیں گوارا کر سکتے تھے کہ آپ کے ان صحابہؓ کی توہین ہو جن کو کسی طمع دنیا وی نہیں محض طلب رضائے حق نے آپ کے ارد گرد اکٹھا کر دیا ہے۔ پس اس موقع پر عبداللہ بن ام مکتوم کے آجانے سے آپ کو اصلی اندیشہ یہی ہوا کہ یہ اشقیا، ان کی پھٹی حالت کو دیکھ کر صحابہؓ پر زبان طعن دراز کرنے کا ایک بہانہ بنا لیں گے اور ان کی توہین کریں گے۔ پس آپ نے جو کچھ کیا غیرت حق اور مصالح تبلیغ و دعوت کے تقاضہ سے کیا لیکن اسی سے یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ آنحضرت جوش تبلیغ دعوت میں اپنے حدود سے کسی قدر آگے نکل گئے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر آپ کو متنبہ کر دیا کہ آپ نے اپنے فرض سے زیادہ ذمہ داری اٹھالی ہے۔ اور کلام کا اسلوب ایسا اختیار فرمایا جس سے بظاہر عتاب مترشح ہوتا ہے، لیکن عتاب کا اصلی رخ کفار و منکرین کی طرف ہے۔ آنحضرت صلعم کی طرف نہیں ہے۔ آپ کی تو اس میں تعریف کی گئی ہے اور ساتھ ہی آپ کے صحابہ کی بھی دلداری کی گئی ہے۔

معاملہ کی اصلی نوعیت کو ایک مثال سے سمجھو۔ فرض کرو کہ ایک نہایت مستعد اور ذمہ دار چرواہا ہے، اسکے گلہ کی کوئی فربہ بھیڑ گلہ سے الگ ہو کر کھو جائے، چرواہا اسکی تلاش میں نکلے۔ ہر قدم پر اسکی کھر کے نئے نئے نشانات اسکو ملتے جا رہے ہیں جنگل کے کسی گوشہ سے اسکی آواز بھی سنائی دے رہی ہے اور اسطرح وہ کامیابی کی امید میں دور تک نکل جاتا ہے اور اپنے اصلی گلہ سے تھوڑی دیر کیلئے غافل ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب وہ واپس آتا ہے۔ آقا اسکو ملامت کرتا ہے کہ "تم پورے گلہ کو چھوڑ کر ناحق ایک دیوانی بھیڑ کے پیچھے ہلکان ہوئے۔ اسکو چھوڑ دیتے بھیڑیا کھا جاتا، وہ اسی کی مستحق تھی"۔ بتاؤ ہمیں عتاب کس پر ہوا چرواہے پر یا کھوئی ہوئی بھیڑ پر۔ بظاہر کھوئی ہوئی بھیڑ پر۔ چرواہے اور گلے کی تو اس میں زیادہ سے زیادہ دلداری ہوئی۔ بالکل یہی صورت معاملہ یہاں بھی ہے۔ عتاب کا رخ سخن بظاہر آنحضرت صلعم کی طرف ہے لیکن خفگی کا تمام زور منکرین و معاندین پر پڑتا ہے۔ آنحضرت صلعم کے لئے تو اس عتاب کے اندر شفقت و التفات کی نہایت جاں نواز ادائیں پنہاں ہیں۔

تعجب ہے کہ سورہ کا یہ مفہوم نہایت واضح ہونے کے باوجود بعض مفسرین سے مخفی رہ گیا اور وہ طرح طرح کی غلط فہمیوں میں پڑ گئے ہم آگے کی فصلوں میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ وبیداللہ التوفیق

(باقی)

تدبر قرآن

۳

امین احسن اصلاحی

تقویٰ اور عمل قرآن مجید کے فہم و تدبر کے لئے ایک نہایت اہم اور ضروری شرط تقویٰ اور عمل ہے۔ بقرہ کی پہلی ہی آیت میں فرمایا ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ — یہ آسمانی کتاب ہے، اس کے آسمانی ہونے میں کوئی شک نہیں متقین کیلئے ہدایت بنکر نازل ہوئی ہے۔

سورہ لقمان میں فرمایا۔

تِلْكَ آيَاتُ الْكِتَابِ الْحَكِيمِ ۝ هُدًى وَرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِينَ — یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں، ہدایت و رحمت بنکر نازل ہوئی ہے محسنین کے لئے۔

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں بے شمار ہیں اور ایک طالب العلم کو ہر جگہ یہ بات کھٹکتی ہے کہ قرآن مجید کی ہدایت متقین و محسنین ہی کے لئے کیوں مخصوص ہوئی؟ جو شخص بھی اس کو پڑھے، چاہئے کہ قرآن اس کی ہدایت کرے، عام اس سے کہ وہ متقی ہو یا غیر متقی، شقی ہو یا سعید، محسن ہو یا غیر محسن! لیکن قرآن مجید کو اس بات پر اصرار ہے کہ اس کا دروازہ صرف انہی لوگوں کے لئے کھلے گا جو تقویٰ اور احسان کی صفتوں سے متصف ہوں۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ بات ہمارے مفسرین کو بھی کھٹکی ہے۔ اور انھوں نے اس کو حل کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ لیکن معاملہ کا ایک خاص پہلو ہے جس کی طرف لوگوں کی نظر نہیں گئی اور اصل حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کے لئے اس کو ٹھیک ٹھیک سمجھ لینا ضروری ہے۔ پس آج کی صحبت میں

Scanned by CamScanner

ہم چاہتے ہیں کہ اس مسئلہ پر غور کریں۔

قرآن مجید کے متعلق یہ امر مسلم ہے، کہ وہ انسان کے روحانی ارتقاء کا آخری زینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی درجہ بدرجہ فرمائی ہے۔ ہدایت کا پہلا درجہ ہدایت فطرت ہے جس کا ذکر الذی قدر فھدی اور فالھمھا فجورھا وتقوٰھا وغیرہ مختلف آیات میں فرمایا ہے۔ یہ آنکھ کان، دماغ اور دل کی رہنمائی اور وجدان و ذوق اور ادراک و تعقل کی ہدایت ہے۔ یہ فطرت کی وہ عام بخشش ہے جس میں تمام بنی آدم یکساں شریک ہیں، بلکہ اس کے ایک حصہ کا فیضان تو اسقدر عام ہے کہ حیوانات تک اس سے محروم نہیں۔ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ مرغی کے بچے دانہ چگتے ہیں۔ بط کے بچے انڈے سے نکلتے ہی پانی میں تیرنے لگتے ہیں۔ بلی کے بچے، ابھی آنکھیں نہیں کھلی ہیں، لیکن جانتے ہیں۔ ان کی غذا کا سرچشمہ اور پرورش کا سامان کہاں ہے۔ انسان اس مرحلہ میں حیوانات کے بالکل ساتھ ساتھ ہے۔ لیکن اس کو شرف امتیاز کا ایک خاص درجہ بھی حاصل ہوا۔ یعنی وہ وجدان و ذوق اور ادراک و تعقل کے شرف سے ممیز ہے۔ پس اس کی فطری رہنمائی صرف اسی قدر نہیں ہے۔ کہ وہ کھائے، پی لے اور سو رہے۔ بلکہ ان کی مدد سے وہ اپنے کاموں میں ایک نظم و ترتیب رکھتا ہے۔ جزئیات سے کلیات بناتا ہے، برے اور بھلے میں امتیاز کرتا ہے اور اختیار و ارادہ کی پوری خودداری اور قوت فیصلہ کے ساتھ شر کو چھوڑتا اور خیر کو اختیار کرتا ہے۔

اس مرحلہ کے بعد ہدایت و رہنمائی کا دوسرا درجہ ہے جو انبیاء و رسل کی بعثت سے ظہور میں آیا۔ اس مرحلہ میں انسان کو جو کچھ ملا وہ تمام تر انہی کلیات و مبادی پر مبنی تھا جن سے وہ ہدایت کے پہلے درجہ میں سرفراز ہوا تھا۔ جس طرح بیج کے چند دانوں سے تم ایک پورا لہلہاتا ہوا چمن تیار کر لیتے ہو یا چند گٹھلیوں کو بو کر ایک پورا سرسبز و شاداب باغ اگا لیتے ہو اسی طرح کشت فطرت کے چند دانوں کو باران رحمت کی پرورش، باغبان فطرت کی رکھوالی اور انبیاء و رسل کی سعی و کاوش نے

ایک چمن بنا دیا اور اس کا نام شریعت ہوا۔

لیکن فطرت کے اس عام دستور کے مطابق، جو اس کے تمام کاروبار کی خصوصیت ہے، یہ کام بتدریج عمل میں آیا، ایک ہی مرتبہ میں انجام نہیں پا گیا۔ پہلے انبیاء آئے جنہوں نے فطرت کی موٹی موٹی صداقتوں کو ابھارا، ان کے گرد و غبار کو صاف کیا اور ان کی زمینوں کو ہموار کیا۔ پھر دوسرے آئے جنھوں نے اس زمین پر ایک داغ بیل ڈالی۔ پھر اور لوگ آئے جنھوں نے اس داغ بیل پر بنیادیں استوار کیں، پھر اور آئے جنھوں نے ان پر دیواریں بلند کیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو بھیجا جنھوں نے اس عمارت کو مسقف کیا، یہاں تک کہ عمارت تیار ہو گئی لیکن کونے میں ایک آخری اینٹ کی جگہ خالی رہ گئی اور وقت آگیا کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کر دیا تھا، وہ کونے کا آخری پتھر بنے چنانچہ وہ اپنی جگہ پر رکھ دیا گیا اور اعلان کر دیا گیا کہ الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔

اس عمارت کا نام اسلام ہوا اور اس کا جامع اور مکمل نقشہ ہمارے ہاتھوں میں قرآن مجید ہے۔

یہ قرآن مجید جب اول اول دنیا کے سامنے آیا تو چند جماعتیں اس کے سامنے تھیں۔

عرب۔ جن میں بیشتر مشرک تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو دین ابراہیمی کی فطری سادگی پر قائم تھے۔

یہود۔ جو اپنی پیہم شرارتوں اور سرکشیوں کی وجہ سے بالکل مسخ ہو چکے تھے۔ صرف ایک چھوٹی سی جماعت ارباب حق و عدل کی ان میں باقی رہ گئی تھی۔

نصاریٰ۔ ان کو بھی ان کے اگلوں کی کجرویوں نے گمراہ کر دیا تھا۔ صرف تھوڑے لوگ رہ گئے تھے جو صحیح دین مسیحی پر قائم تھے۔

ان تینوں جماعتوں میں سے قرآن مجید نے سب سے پہلے عربوں کو مخاطب کیا۔ گو ان کی عام اخلاقی زندگی بعض فطری فضائل و محاسن سے خالی نہ تھی لیکن یہ اپنے پیچھے شرک و بت پرستی کی ایک طویل تاریخ رکھتے تھے جس میں ان کی طبیعت اور دماغ کا سانچہ اسقدر بدل چکا تھا کہ قرآن مجید کی تعلیمات جو سرتا سر فطری سادگی

کے حسن و جمال سے آراستہ تھیں، ان میں بڑی مشکل سے سما سکتی تھیں۔ چنانچہ ان کا بڑا طبقہ عرصہ تک قرآن کی تعلیمات سے نہ صرف بیگانہ رہا بلکہ اس کے مٹانے کے لئے پوری طرح سرگرم عمل۔ البتہ ان لوگوں کو قرآن مجید کے قبول کر لینے میں کوئی زحمت نہیں پیش آئی جو دین ابراہیمی کی فطری سادگی پر قائم اور شرک و بت پرستی سے پہلے ہی سے نفور تھے۔ انھوں نے قرآن مجید کی دعوت سنی تو ان کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا اپنے ہی دل کی آواز سن رہے ہیں پس وہ فوراً اس کی طرف لپکے اور اس کو قبول کر لیا۔ ان کو نہ تو معجزات کی ضرورت پیش آئی، نہ اصرار و الحاح کی، یہ پیاسے تھے، پس جوں ہی پانی کی صدا سنی اسکی طرف دوڑ پڑے۔ بحث و مناظرہ کے طلبگار نہ ہوئے۔ ہدایت فطرت کی روشنی ان کے اندر زندہ تھی۔ اور جنکی آنکھیں کھلی ہوں انکو روشنی سے زیادہ عزیز کوئی شے نہیں ہوتی۔ پس جس طرح آئینہ روشنی میں چمک جاتا ہے، یہ بھی روشنی پاکر چمک اٹھے۔ قرآن مجید نے سورہ نور میں اس کو یوں بیان فرمایا کہ فطرت اور وحی دونوں ایک ہی جنس کی چیزیں ہیں۔ یہ دونوں بندے کو ایک ہی سرچشمہ سے ملتی ہیں۔ صحیح فطرت کی مثال صاف و شفاف روغن کی ہے جو ہر طرح کی آمیزش اور ملاوٹ سے بالکل پاک ہے۔ اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ بغیر اس کے کہ اس کو آگ چھوئے بھڑک جانے کے لئے تیار رہتا ہے۔ پس جونہی وحی و الہام کی روشنی اس سے مس ہوتی ہے فوراً بھڑک اٹھتا ہے يكاد زيتها يضئ ولو لم تمسسه نار، نور على نور يهدى الله لنوره من يشاء

مضمون کے صدر میں ہم نے جس آیت کا حوالہ دیا ہے اس میں محسنین سے ایسے ہی لوگ مراد ہیں۔ احسان کے معنی ایک تو وہی ہیں جو ہم عام طور پر سمجھتے ہیں۔ دوسرا ایک اور مفہوم بھی ہے جو لفظ کی لغوی روح سے بہت اقرب ہے اور قرآن مجید نے اسی مفہوم میں ایک سے زائد مقامات میں اس کو استعمال کیا ہے۔ یعنی اپنے قول و فعل کو اخلاص و صداقت کی پوری بیداری اور ہمت و عزیمت کی پوری استواری کے ساتھ انجام دینا اہل لغت نے لفظ کی اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ احادیث میں بھی احسان کی یہ حقیقت بیان ہوئی ہے۔ اور قرآن مجید نے اسی مفہوم کے اعتبار سے اہل مکہ یا اہل کتاب

Scanned by CamScanner

کی ان جماعتوں پر اس کا اطلاق فرمایا جنھوں نے فطرت اور وحی کی روشنی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اور اس کو گل ہونے نہیں دیا۔ ایسے لوگوں کی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ تعریف فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان کو دوست رکھتا ہے، ان کے عمل کو ضائع نہیں کرے گا، قرآن مجید ان کے لئے ہدایت و رحمت ہے۔ یہ اس کو سمجھتے ہیں اور اس کی تعلیمات سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

باقی رہی دوسری جماعت، جس نے اپنی فطری صلاحیتیں بالکل برباد کردی تھیں، تو اس کے لئے قرآن مجید کی تعلیمات بالکل انوکھی تھیں۔ وہ کسی طرح بھی ان کو سمجھ نہیں سکتی تھی۔ یہ تعلیمات جن فطری اصولوں پر مبنی تھیں وہ تمام اصول ان کے اندر مٹ چکے تھے۔ اور ان کی جگہ بالکل غیر فطری معتقدات و مظنونات نے لے لی تھی۔ پس ان کی فطرت کا قالب اس درجہ ٹیڑھا ہوچکا تھا کہ کوئی سیدھی چیز اس میں نہیں سماسکتی تھی۔ چنانچہ جب آنحضرت صلعم نے ان کے سامنے قرآن مجید پیش کیا تو انھوں نے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور اس کے سننے اور سمجھنے سے انکار کردیا۔ اور ان کا یہ انکار درحقیقت ان کے بہت سے سابق انکاروں کا لازمی نتیجہ تھا۔ انھوں نے ہدایت کے ابتدائی مراحل میں اسکو قبول کرنے سے اعراض کیا اس لئے بعد کے مرحلوں میں بھی اس کا ساتھ نہ دے سکے۔ اور ایسا ہوتا قدرتی تھا۔ ایک طالب علم درجہ بدرجہ علم کی راہوں میں بڑھتا ہے۔ پس جس نے ایک فن کے ابتدائی قواعد خوب نہ سمجھ لئے ہوں اور ان کی مہارت نہ کرلی ہو وہ ہرگز اس فن کے انتہائی مباحث نہیں سمجھ سکتا۔ یہی حال ان کا ہوا۔ انھوں نے رشد و ہدایت کی ابجد نہیں سیکھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ہدایت کا آخری صحیفہ نازل ہوا تو وہ اس کے سمجھنے سے بالکل قاصر رہے۔ قرآن مجید نے سورہ اعراف میں اس معاملہ کی پوری تشریح کردی ہے۔

تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنْبَآئِهَا ۚ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ

یہ بستیاں ہیں جن کے واقعات ہم تم کو سناتے ہیں، بے شک آئے ان کے پاس انکے انبیاء

بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا — کھلی کھلی نشانیاں لیکر لیکن وہ ایمان لانیوالے
بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ — نہیں ہوئے۔ بوجہ اس کے کہ انھوں نے پہلے تکذیب
يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ (الاعراف) کی۔ ایسی ہی اللہ مہر کر دیتا ہے کافروں کے دلوں پر

یعنی ان لوگوں کا یہ تازہ انکار بہت سے سابق انکاروں کا ثمرہ ہے۔ سابق انبیاء نے ان کو جو سبق پڑھائے انھوں نے ان سب سے اعراض کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ سبق بھی انکی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ یہی چیز ہے جس کو قرآن مجید اپنی اصطلاح میں ختم قلوب کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی جو شخص خدا کی بخشی ہوئی ہدایت کو درجہ بدرجہ تمام مراحل میں قبول کرنے سے اعراض کرتا ہے، بالآخر اسکا قلب سخت ہو جاتا ہے اور وہ اپنی فہم و بصیرت کی تمام استعدادیں کھو بیٹھتا ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہنا چاہیے کہ خدا کی شریعت عمل کے لئے نازل ہوتی ہے۔ اس لئے اس میں علم اور عمل یا "جاننا" اور "کرنا" دو چیزیں نہیں ہیں۔ اس میں جاننا بعینہٖ وہی چیز ہے جس کو کرنا کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص جانتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا تو وہ جاننا یہاں معتبر نہیں۔ ایسا جاننا بے سود ہے۔ اسکی حقیقت اور جہل کی حقیقت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ علم بالکل غیر مثمر ہے۔ اس سے مزید علم و عمل کے دروازے نہیں کھلتے۔ ہم نے محض اپنی غلط فہمی یا کوتاہی تعبیر کی وجہ سے جہل کا نام علم رکھ لیا ہے۔

یہود کے معاملہ میں بھی بالکل یہی صورت حالات پیش آئی۔ یہود کی اکثریت نے جس نے اپنے تمام انبیاء کی تعلیمات جھٹلا دی تھی، قرآن مجید کا بھی انکار کر دیا، حالانکہ قرآن مجید سے سب سے زیادہ اقرب وہی تھے۔ قرآن مجید ہدایت کا آخری زینہ ہے اور وہ اس زینہ سے صرف ایک ہی درجہ نیچے تھے۔ ان کا فرض تھا کہ وہ اس کو سب سے پہلے قبول کرتے اور نبی امی (فدیتہ بابی و امی) کے ساتھ ہو کر تمام دنیا میں اس کے حق ہونے کی گواہی دیتے لیکن انھوں نے سب سے پہلے انکار کیا اور اس انکار کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید سے پہلے جو ہدایتیں نازل ہوئی تھیں وہ ان سب کا انکار کر چکے تھے اور سنت الٰہی کے لحاظ سے قرآن مجید کو قبول کرنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ پچھلی تمام ہدایتوں کو قبول

کر چکے ہوں۔ اصولی طور پر یہ بات حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بالکل ابتدا ہی میں فرما دی گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو چند امتحانوں میں جانچا اور جب وہ ان میں پورے اترے، فرمایا انی جاعلک للناس اماما۔ میں تم کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔ انھوں نے سوال کیا۔ ومن ذریتی۔ اور میری ذریت میں سے یا رب! جواب ملا لاینال عہدی الظلمین۔ میرا یہ عہد ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔ یعنی میرا یہ عہد صرف ان کے متعلق ہے جو برابر خدا کی ہدایت پر قائم رہیں، اس کو ہر مرحلہ میں قبول کریں، اور شرک و بت پرستی سے بچتے رہیں۔ یہی لوگ خدا کی ہدایت سے برابر سرفراز ہونگے۔ اور قوموں کی امامت پائیں گے۔

یہی بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں دہرائی گئی۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اپنی قوم کے لئے دعا فرمائی۔

وَاكْتُبْ لَنَا فِي هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً	لکھ دے ہمارے لئے اس دنیا میں بھلائی اور
وَّفِي الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ	آخرت میں بھلائی ہم تیری طرف رجوع ہوئے۔

جواب میں ارشاد ہوا۔

عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ	میرا عذاب تو میں جس پر چاہتا ہوں (یعنی جو اس کا
وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا	مستحق ہوتا ہے) اس کو نازل کرتا ہوں۔ اور میری رحمت
لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ	ہر چیز کو عام ہے پس میں اسکو لکھ رکھوں گا ان لوگوں

جو تقویٰ پر قائم رہیں

"جو تقویٰ پر قائم رہیں گے" یعنی وہ لوگ جو اس عہد پر جو آج ان سے باندھا جا رہا ہے، قائم رہینگے اور اس کی حرمت کو بٹہ نہیں لگائیں گے۔ وہی لوگ آیندہ خدا کی رحمت کے مستحق ہوں گے۔ یعنی جب خدا کی آخری شریعت جو اس دنیا پر خدا کی آخری اور سب سے بڑی رحمت ہوگی، آئے گی، وہ اس کو قبول کریں گے۔ اس کا انکار نہیں کریں گے اور جو اس عہد پر قائم نہ رہیں گے وہ آیندہ رحمت سے

بھی محروم رہیں گے۔ کیونکہ ان کے دل سخت ہو جائیں گے اور ان کے کفران نعمت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے دلوں پر مہر کر دے گا۔ چنانچہ جب قرآن مجید نازل ہوا اور اس کی وہ سورۃ اتری جو سرتاسر یہود کو مخاطب کر رہی ہے۔ یعنی سورہ بقرہ تو اس کی پہلی ہی آیت میں فرمایا کہ: ”ھدی للمتقین“ یہ کتاب متقین کے لئے ہدایت بنکر نازل ہوئی ہے۔ اس کو صرف وہی قبول کریں گے جو متقی ہیں۔ جنھوں نے اپنے عہد و پیمان کو قائم رکھا ہے، جنھوں نے خدا کی نعمت کی قدر کی ہے، جنھوں نے اپنے انبیاء کی تعلیمات کو یاد رکھا ہے۔ باقی جنھوں نے ان تمام چیزوں کا انکار کر دیا ہے، وہ اس قرآن کا بھی انکار کر دیں گے۔ کیونکہ ان کے فسق و نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ	بے شک جنھوں نے کفر کیا، برابر ہے ان کے لئے،
ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ	ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے
لَا يُؤْمِنُونَ خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ	ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور
قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ	ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور ان کے لئے دردناک
أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ	عذاب ہے ....
عَظِيمٌ (بقرہ ۲)	....

جو خدا سے عہد باندھ کر توڑ چکے ہیں، جو خدا کے قائم کئے ہوئے رشتہ پر مقراض چلاتے ہیں۔ جو زمین میں خدا کے قانون حق و عدل کے دشمن ہیں۔ وہ ہرگز قرآن کی ہدایت نہیں قبول کریں گے۔ وہ تو اس سے بجائے ہدایت پانے کے اپنی گمراہی اور شرارت میں اور بڑھ جائیں گے اور ان کی شقاوت و بدبختی پر آخری مہر لگ جائے گی۔

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا	اس کے ذریعہ اللہ بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور
وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ	بہتوں کو ہدایت دیتا ہے اور نہیں گمراہ کرتا اس کے

Scanned by CamScanner

اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ	ذریعہ گمراہ ان لوگوں کو جو نافرمان ہیں جو اللہ کے عہد کو
بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ	پکا کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور جس چیز کو اللہ نے
اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ	جوڑنے کا حکم دیا ہے اس کو کاٹتے ہیں اور
فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ (بقرہ)	زمین میں فساد برپا کرتے ہیں، وہی لوگ نامراد ہیں

اور ایسا ہی ہونا بھی چاہئے، خدا کی ہدایت ایک نعمت ہے اور نعمت اسی شخص کو دیجاتی ہے جو اس کی قدر کرے اور اس سے فائدہ اٹھائے۔ جو شخص نعمت کی ناقدری کرتا ہے وہ ہرگز مزید نعمت پانے کا مستحق نہیں ہے۔ ہدایت کے باب میں یہ قانون ہمیشہ سے بالکل اٹل ہے، جنھوں نے نعمتوں کو قبول کیا وہ نعمتوں میں بڑھتے گئے اور جنھوں نے ان کی ناقدری کی وہ ان سے محروم ہو گئے۔ بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قانون سے پوری طرح آگاہ کر دیا تھا اور اسی کے مطابق ان کے ساتھ معاملہ کیا۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ	اور یاد کرو جب کہ تمھارے پروردگار نے تم کو
لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ	جتا دیا تھا کہ اگر تم شکر کروگے تو میں تمھارے لئے اپنی
اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ (۷۔ ابراہیم)	نعمت زیادہ کر دونگا، اور اگر ناشکری کروگے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے

پس چونکہ بنی اسرائیل نے اللہ کی بخشی ہوئی نعمت کی قدر نہیں کی تھی اس لئے وہ قرآن کی نعمت سے بہرہ مند ہونے کے مستحق نہیں ٹھہرے۔ اور جیسا کہ فرمایا گیا تھا "جو ایک پیسہ میں چور ہے اس کو ایک لاکھ کی امانت نہیں سونپی جائے گی"۔ قرآن کی عظیم الشان امانت سے وہ محروم ہے۔ ان کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا جب اس میں وہ راستباز اور امین نہیں ثابت ہوئے تو خدا ان کو اپنی پوری کتاب کیسے سونپ دیتا!

پس یہود کا بڑا حصہ جو توراۃ وانجیل کی تعلیمات کو چھوڑ کر شہوات نفس اور رغبات دنیا کا

Scanned by CamScanner

شکار ہو چکا تھا، قرآن کے فیض سے بالکل محروم رہا، صرف ایک مختصر سی جماعت ان میں اہل حق کی باقی رہ گئی تھی۔ یہ لوگ قرآن مجید کی آمد کے منتظر تھے اور جونہی اس کی صدا ان کے کانوں میں پڑی انھوں نے اس کو قبول کر لیا۔ قرآن مجید نے جہاں جہاں یہود کی عام بدبختی کا ذکر کیا ہے وہاں اس چھوٹی سی جماعت کی حق پسندی کی تعریف بھی فرمائی ہے۔

ٹھیک ٹھیک یہی حال نصاریٰ کا ہوا۔ ان کی جماعت کا بڑا حصہ جو اپنے اگلوں کی تقلید و پیروی میں گمراہ ہو کر دین کی اصلی تعلیمات سے محروم ہو چکا تھا۔ اس نے قرآن کو نہیں سمجھا۔ قرآن کی تعلیمات اس کو اپنے معتقدات و مزعومات کے بالکل مخالف نظر آئیں۔ مگر جن میں صحیح تعلیم کی روشنی موجود تھی اور حضرت مسیحؑ کے اشارات کی رہنمائی میں اس کے لئے متجسس تھے انھوں نے جب قرآن کو پایا تو پورے جوش کے ساتھ استقبال کیا۔ قرآن مجید نے ان کے اس جوش کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے۔

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى	اور جب وہ سنتے ہیں اس چیز کو جو اتاری گئی رسول کی طرف
الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ	(یعنی قرآن) تو تم دیکھتے ہو ان کی آنکھوں کو کہ
تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا	ان سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اس لئے کہ انھوں نے
مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا	حق کو پہچان لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب
فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ وَمَا	ہم ایمان لائے پس ہم کو لکھ لے گواہوں کے ساتھ اور
لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَا جَآءَنَا	کیوں نہ ہم ایمان لائیں اللہ پر اور اس حق پر جو
مِنَ الْحَقِّ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا	ہمارے پاس آیا در انحالیکہ ہم متوقع ہیں کہ ہمارا
رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ (المائدہ)	پروردگار ہمکو نیکوکاروں کے ساتھ جنت میں داخل کرے گا۔

یہ تمام نصاریٰ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ انھوں نے اپنے عقائد و اعمال مسخ نہیں کئے تھے۔

Scanned by CamScanner

بلکہ ہوشیار اور مستعد طالب علم کی طرح جو کچھ ان کو پڑھایا گیا تھا اس کو پوری طرح محفوظ رکھا تھا اور اب مزید سبق کے لئے بیتاب تھے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو محسنین کے لقب سے ممتاز کیا۔

فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ	پس ان کے اس قول کے صلہ میں، اللہ نے ان کو ایسے
تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ	باغ دیئے جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اس میں ہمیشہ
فِیْهَا وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِیْنَ ۝	رہیں گے اور یہ بدلہ ہے محسنین کا۔

اس تفصیل کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ قرآن مجید کے متعلق جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ یہ ہدایت ہے متقین کے لئے۔ یہ ہدایت ہے محسنین کے لئے تو اس کا مفہوم اس سے کسی قدر وسیع ہے جو ہم عام طور پر سمجھتے ہیں۔

اب ان مباحث کے اس نتیجہ پر غور کرو جو قرآن مجید کے فہم و تدبر کے متعلق ان سے مستنبط ہوتا ہے۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے، پس اس کا فہم و تدبر ان ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے جو اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کے شکر گذار ہوں اور اس کی شکر گذاری یہ ہے کہ یہ جس مقصد کے لئے ان کو دی گئی ہے اس مقصد کو پورا کریں، دل سے اس کی قدر کریں اور اپنی عملی و اعتقادی زندگی پر اس کو پوری طرح طاری کر لیں۔ پس جوں جوں وہ اس نعمت کی قدر و احترام میں بڑھتے جائیں گے اسی قدر اس کی برکتیں ان کے لئے بڑھتی جائیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ایک ساتھ نہیں نازل ہوا، تھوڑا تھوڑا کرکے نازل ہوا تاکہ امت کی قدر دانی اور شکر گذاری کا پورا پورا امتحان ہو جائے اور جس طرح ایک طالب علم درجہ بدرجہ کسی فن کو حاصل کرتا ہے اسی طرح امت بھی بتدریج سبقاً سبقاً اس کو سیکھے اور اس کی تعلیمات کو پوری طرح اپنے اندر جذب کر لے۔ چنانچہ جو طریقہ قرآن مجید کے نزول کا تھا وہی طریقہ مسلمانوں نے اس کے اخذ و تعلم کے لئے اختیار کیا۔ اس کی ایک ایک آیت کو لیتے۔ اس پر فکر و تدبر کرتے۔

عملاً اس کی مشق و تمرین کرتے اور جب اس کو اپنے عمل و اعتقاد میں پوری طرح گھلا لیتے تب آگے قدم بڑھاتے۔ اتقان میں ہے۔

وقد قال ابو عبد الرحمٰن السلمی حدثنا	ابو عبد الرحمٰن سلمی کہتے ہیں کہ مجھ سے ان لوگوں نے
الذین کانوا یقرؤن القرآن کعثمان	بیان کیا جو قرآن مجید پڑھتے پڑھاتے تھے مثلاً
بن عفان وعبد اللہ بن مسعود وغیرہما	عثمان بن عفان اور عبد اللہ بن مسعود وغیرہ
انہم کانوا اذا تعلموا من النبی صلی اللہ علیہ وسلم	کہ ان لوگوں کا دستور یہ تھا کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے
عشر آیات لم یتجاوزوہا حتی یعلموا	دس آیتیں پڑھ لیتے تھے، تو جب تک ان آیات
ما فیہا من العلم والعمل قالوا فتعلمنا القرآن	کے تمام علم و عمل کو اپنے اندر جذب کر لیتے، آگے
والعلم والعمل جمیعاً ولہذا کانوا یبقون	قدم نہ بڑھاتے انھوں نے کہا کہ ہم نے قرآن کے
مدۃ فی حفظ السورۃ	علم و عمل دونوں کو ایک ساتھ حاصل کیا ہے۔

چنانچہ ابن عمرؓ کے متعلق ہے:

اقام ابن عمر علی حفظ البقرہ ثمانی سنین	حضرت ابن عمرؓ نے بقرہ کے حفظ پر پورے آٹھ سال

اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کا مطالعۂ قرآن ہمارے مطالعہ سے بالکل مختلف تھا۔ وہ قرآن کو صرف علمی حیثیت سے جان لینے کے شائق نہ تھے بلکہ ان کی اصلی طلب اس کی تعلیمات کی عملی ممارست کے لئے تھی اور جب تک ایک آیت کو وہ اپنے علم و عمل کا جزو نہیں بنا لیتے تھے اس وقت تک دوسری آیت کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ اور یہی اس شکر کی اصلی حقیقت ہے جو ازدیاد نعمت کا باعث ہوتا ہے۔ (لئن شکرتم لازیدنکم) چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے فہم و بصیرت کو اپنے انوار سے نورانی فرمایا اور صرف اسی ایک کتاب کے علم و عمل سے دونوں جہان کی تمام سربلندیاں ان کو بخشدیں۔

(باقی)

مُذاکرہ

استدراک پر ''نظر''

از جناب مولوی اختر احسن صاحب اصلاحی

الاصلاح کے پچھلے نمبروں میں پرویز صاحب کے نظریہ نجات پر جو استدراک میں نے لکھا تھا، اگست کے پرچے میں اس استدراک پر پرویز صاحب نے ایک ''نظر'' ڈالی ہے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ ان کے اصل مضمون کی طرح ان کی یہ نظر بھی بالکل سطحی ہے اس لئے مجھے چند حرف اسکی نسبت بھی عرض کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

میرا خیال ہے کہ جن لوگوں نے غور و فکر کے ساتھ پچھلی تحریرات پڑھی ہوں گی وہ فریقین کے زاویۂ نگاہ اور ہر ایک کے دلائل کی حقیقت سے پوری طرح واقف ہو چکے ہوں گے۔ اب اس مسئلہ پر مزید بحث کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ خود پرویز صاحب میرا مدعا سمجھنے سے اپنے تئیں قاصر ظاہر کر رہے ہیں اسلئے چاہتا ہوں کہ ایک مرتبہ اپنی پچھلی تحریر کے بعض مباحث کی طرف اور توجہ دلا دوں۔ ممکن ہے اس سے کچھ فائدہ ہو۔ اگر اس کے بعد بھی ان کو اپنی رائے پر اصرار رہا تو مجبوری ہے۔ میں ان سے یا کسی شخص سے مناظرہ نہیں کرنا چاہتا۔ مناظرہ نہ صرف بے نتیجہ بلکہ نہایت مضر چیز ہے۔ لوگ اصل مسئلہ سے ہٹ کر بالکل غیر متعلق بحثوں میں پڑ جاتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بحث و نظر کا کوئی گوشہ تعمیر کرنا تو الگ رہا، ہم اپنی تہذیب اور اخلاق کے بچے کھچے آثار بھی مٹا کے رکھ دیتے ہیں۔

پس میں محض چند لفظوں میں اپنا مدعائے ضروری الاظہار عرض کروں گا اور ان غیر متعلق باتوں سے اصلاً تعرض نہ کروں گا جو پرویز صاحب نے اپنی تحریر میں چھیڑ دی ہیں۔

Scanned by CamScanner

(۱) سورہ مریم کی آیت وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا الآیہ۔ کے متعلق میری گذارش پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے اسے پڑھکر مجھے تعجب ہے کہ آپ پر میرا مدعا واضح نہ ہو سکا حالانکہ بات بالکل صاف تھی۔ میں نے یہ عرض کیا تھا کہ آپ نے اس خوف سے کہ کہیں اس آیت سے لوگ دوزخ سے نکلکر جنت میں جانا نہ سمجھ لیں، آیت کی جو تاویل فرمائی ہے وہ تاویل صحیح نہیں ہے۔ بالکل غلط ہے۔ اگر الفاظ کے صحیح معنی لئے جائیں گے اور ایسا کرنا ضروری ہے تو آپ کی اس احتیاط اور دوربینی کے باوجود آیت کا وہی مطلب ثابت ہو جائے گا جس سے آپ بھاگنا چاہتے ہیں، بلاشبہہ میری بحث کا اصلی محور لفظ ورود تھا۔ اس میں بھی شبہہ نہیں کہ میں نے اس لفظ کے دو معنی بیان کئے تھے لیکن ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا تھا کہ اس جگہ اس کے معنی قرب کے نہیں لئے جا سکتے۔ موقع و محل مقتضی ہے کہ یہاں دخول کے معنی لئے جائیں۔ اور یہ اصول شاید آپ کو معلوم ہو کہ جب کوئی لفظ دو معنوں کو محتمل ہوتا ہے تو تعیین معنی کا فیصلہ موقع و محل کا اقتضا کرتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ بلا لحاظ موقع و محل آپ جو معنی چاہیں اختیار کر لیں۔ عربی کا ایک مبتدی طالب علم بھی اس موٹی سی بات کو جانتا ہے۔

اور موقع و محل کے اقتضا کی نسبت یہ عرض کیا تھا کہ یہاں ورود کے معنی صرف دخول ہی کے لئے جا سکتے ہیں اس لئے کہ اس کے بعد ہی فرمایا ہے ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا۔ پھر ہم پرہیزگاروں کو بچا لیں گے اور نافرمانوں کو گھٹنوں کے بل چھوڑ دیں گے۔ آپ نے اردو ترجموں میں "چھوڑ دیں گے" دیکھا اور اس سے یہ سمجھ لیا کہ مومنین کو دوزخ کے اوپر سے گذاریں گے اور کفار کو جس طرح اوپر سے کوئی چیز کنوئے یا غار میں ڈالی جاتی ہے، دوزخ میں چھوڑ دیں گے۔ حالانکہ معاف کیجئے گا یہ چھوڑ دینا اس سے بالکل مختلف ہے جو آپ نے سمجھا ہے۔ "وذر" کے معنی ہیں کسی چیز کو اس کی اپنی حالت اور جگہ میں پڑا ہوا چھوڑ دینا۔

اب اس معنی کو پیش نظر رکھکر غور فرمائیے کہ آپ کی تاویل صحیح ہے یا نہیں؟ لفظ کے اس

معنی کے اعتبار سے تو وہی تاویل واضح معلوم ہوتی ہے جس سے آپ بچنا چاہتے ہیں یعنی یہ کہ منکم کے تمام مخاطب دوزخ میں داخل ہوں گے پھر حسب الَّذِیْنَ اتَّقَوْا کے حکم میں داخل ہوں گے وہ نکال لئے جائیں گے اور جو ظالمین میں ہوں گے وہ اپنی حالت اور اپنی جگہ پر اوندھے منہ پڑے چھوڑ دیئے جائیں گے۔ ہمارے اس شبہ کو رفع کرنے کے لئے آپ کے لئے مناسب راہ یہ تھی کہ یا تو ورود کے جو معنی بیان کئے گئے آپ اس کی تردید فرماتے اور اپنی معنی کی تائید میں کوئی ثبوت پیش کرتے یہاں تک کہ ورود کے معنی قرب کے لئے جاسکتے یا کم سے کم یہ کرتے کہ آپ ہمارے اختیار کردہ معنی کو اختیار کرتے ہوئے آیت کی کوئی ایسی تاویل فرماتے جس سے آپ کے خیال کی تائید ہو جاتی۔ مگر یہ تو کوئی ٹھیک بات نہیں ہوئی کہ محض اس ڈر کے مارے کہ کہیں کوئی شخص آپ کے زعم کے خلاف اس آیت سے دوزخ میں داخل ہونے کے بعد جنت میں جانا نہ سمجھ لے الفاظ کے صحیح معنی بدل ڈالیں اور اپنی طرف سے ایک معنی وضع کر کے آیت کی من مانی تاویل کر دیں اور جب آپ کو اس کی طرف توجہ دلائی جائے تو بجائے اسکے کہ کلام عرب کی کوئی شہادت پیش کریں شاہ رفیع الدین صاحبؒ کا ترجمہ کھول کر بیٹھ جائیں۔

ہم کو تسلیم ہے کہ جس طرح قرب کے معنی لینے میں یہ آیت بعض دوسری آیات سے جن میں مومنین کو دوزخ سے دور رکھے جانے کا ذکر ہے متعارض ہوتی ہے اس سے کہیں بڑھکر دخول کے معنی لینے میں متعارض ہوتی ہے۔ اس تعارض کا انکار نہ آپ کر سکتے ہیں نہ میں۔ چنانچہ اس کا ذکر میں نے پچھلے مضمون میں کیا تھا اور اپنی طرف سے بعض وجوہ رفع تعارض کی طرف بھی اشارہ کیا تھا لیکن افسوس ہے کہ آپ نے اس کی طرف توجہ نہیں فرمائی اور اسی لئے آپ کو یہ پوچھنا پڑا۔ "لیکن میں پوچھتا ہوں کہ جب ورود کے معنی دخول کے لئے جائیں تو کیا پھر بھی تضاد عاید نہ ہوگا یہ تو اور بھی شدت کا تضاد ہوگا"۔ لیکن اگر اجازت ہو تو ہم بھی نہایت ادب سے ایک بات دریافت کریں کہ کیا تعارض کے رفع کرنے کی صرف یہی صورت ہے کہ الفاظ کے معنی بدل دئے جائیں اگر یہ اصول مان لیا جائے

تو بہت سی مشکلات سے چھٹی تو مل جائے گی لیکن اس کو دنیا میں رائج کرنے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ شاہ رفیع الدینؒ کے ترجمہ کے سوا لغت و ادب اور تفسیر کا تمام ذخیرہ پہلے ناپید کر دیا جائے اور یقیناً اس دور کے لئے ابھی ہم کو اور آپ کو کچھ دن انتظار کرنا پڑیگا۔ پس اس وقت تک کیلئے، تو ناگزیر ہے کہ الفاظ کے صحیح معنی اختیار کرتے ہوئے کوئی ایسی تاویل فرمایئے کہ اشکال بھی رفع ہو جائے اور آپ کا مطلب بھی نکل آئے اور اگر ایسی کوئی تاویل سمجھ میں نہیں آتی تو ہم کو آپ کے ساتھ دلی ہمدردی ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ وہی راہ اختیار کیجئے جس کا اختیار کرنا ہے۔ تو نفس پر بہت شاق ہےلیکن بہتوں کو اختیار کرنی پڑتی ہے بلکہ ارباب علم کی محبوب ترین راہ یہی ہے۔ یعنی اعتراف عجز۔ آخر آپ تمام علم کے تنہا ٹھیکہ دار ہو کے تو آئے نہیں ہیں؟

اس تضاد کے رفع کرنے کی ایک صورت میں نے عرض کی تھی، شاید یاد ہو لیکن پھر عرض کرتا ہوں کہ جن آیات میں متقین کو جہنم سے دور رکھے جانے کا ذکر ہے وہ ایک مخصوص جماعت ہے جو دنیا ہی میں گناہوں سے پاک ہو چکی ہوگی۔ مرنے کے بعد حساب وغیرہ سے بالکل آزاد ہوگی۔ انہی لوگوں کی نسبت فرمایا گیا ہے کہ "لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا" یہ آیات ان مومنین سے متعلق نہیں ہیں جو گناہوں کیساتھ دنیا سے جائیں گے۔ ان کا ذکر سورہ مریم کی زیر بحث آیت میں ہوا ہے اور ثم ننجی الذین اتقوا سے ایسے ہی لوگ مراد ہیں جو ایمان و تقویٰ بھی رکھتے تھے اور ساتھ ہی معاصی کی آلودگی بھی خلطوا عملاً صالحاً و آخر سیئاً" یہ ہماری تاویل نہیں ہے۔ دوسروں کی ترجمانی ہے اور محض اس لئے عرض کر دی گئی تھی کہ اشکال کے رفع کرنے کی ایک شکل یہ بھی ہے۔ ورنہ ہمارے نزدیک اس آیت کی تاویل ان تمام شبہات و شکوک سے بالاتر ہے۔ مگر ہم نے اس کو اس لئے بیان کرنا ضروری نہیں سمجھا کہ اس وقت آپ کے مضمون کی بدولت دنیا میں ایک نئے نظریہ کا اضافہ ہو رہا تھا ہم نہیں چاہتے تھے کہ اس میں ہماری تاویل مخل ہو جائے اور اس بات پر پوری طرح راضی تھے کہ اگر آپ ہمارے بعض شبہات کا

ازالہ کر دیں گے تو ہم بھی اس نظریہ کو جو دنیا میں سب سے پہلی مرتبہ آپ ہی نے پیش کیا ہے، تسلیم کرلیں گے۔

بہرحال رفع تعارض کی ایک شکل یہ پیش کی گئی تھی، مگر یہ آپ کے مدعا کے خلاف ہے اس لئے اب آپ ہی کوئی شکل پیدا کیجئے، مگر خدارا الفاظ کے صحیح معانی کا خیال رکھئے گا۔

آپنے اس بات پر بڑے تعجب اور رنج کا اظہار کیا ہے کہ ہم سے ایک حدیث کا انکار ہو گیا۔ اس بات کا یہ پہلو تو نہایت خوشکن ہے کہ انکار حدیث آپکے نزدیک بھی معیوب ہے، لیکن ساتھ ہی اس سے یہ معلوم کرکے مایوسی ہوئی کہ آپ فن حدیث کے معاملات سمجھنے میں تفسیر قرآن سے بھی کچھ آگے ہیں حالانکہ اردو میں اس فن کی بعض چیزیں موجود ہیں اور اہل تحقیق کے لئے اجتہاد کی راہ باز۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ نہایت آسانی سے ممکن ہے کہ ایک حدیث اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہو لیکن وہ ایک آیت کی تفسیر نہ ہو؟ ہو سکتا ہے کہ آیت کا منشا کچھ اور ہو۔ اور حدیث کا کچھ اور۔ اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہوں۔ فرض کیجئے کہ اس آیت کے بجائے کوئی اور آیت لے لی جائے اور اس کی تاویل ٹھیک ٹھیک اسی حدیث کے مطابق کر دی جائے اگو سیاق و سباق اور الفاظ اس تاویل سے ابا کر رہے ہوں تو کیا اس تاویل کی مخالفت محض اس لئے ناجائز ہو جائے گی کہ وہ حدیث کے مطابق ہے۔ اور اس کی مخالفت عین حدیث کی مخالفت ہوگی؟

اور پھر یہ حدیث میرے عقیدہ کے خلاف کب ہے! اس میں تو ایک ایسی جماعت کا بھی ذکر ہے جو ایک وقت تک سزا پا کر نجات حاصل کریگی۔ بہرحال اس موقع پر حدیث کے ماننے نہ ماننے کا سوال ہی نہ تھا سوال آپ کی تاویل کی صحت و عدم صحت کا تھا اور میری معروضات تمامتر اسی سے متعلق تھیں،

(۲) میں نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ حبط اعمال کفر و شرک سے ہوتا ہے اور نہایت واضح مقدمات سے یہ ثابت کیا تھا کہ خلود جہنم مومن کے لئے نہیں ہے لیکن پرویز صاحب نے سورہ حجرات کی ایک

Scanned by CamScanner

آیت پیش کرکے اپنے خیال میں میرے ان مقدمات کی جو قرآن کی صریح آیات پر مبنی تھے بالکل بنیاد ہی ڈھادی۔

وہ آیت یہ ہے۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ	اے ایمان والو نبی کی آواز پر اپنی آوازوں کو بلند نہ کرو
فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ	اور اس کے سامنے زور سے نہ بولو جس طرح تم میں کا ایک
كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ	دوسرے کے سامنے زور سے بولتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمھارے اعمال
وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ	حبط ہو جائیں اور تمھیں احساس نہ ہو۔

اس آیت کی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ ایک مومن کے اعمال نبی کی آواز پر اپنی آواز بلند کرنے سے بھی ڈھ جاتے ہیں حالانکہ یہ فعل شرک و کفر نہیں ہے۔ لیکن میں کیسے عرض کروں کہ سورہ مریم والی آیت کی طرح پرویز صاحب اس آیت کو بھی نہیں سمجھے اور مانع فہم غالباً یہاں بھی وہی ہے جو وہاں تھا لیکن اگر ان کو تو یہ کہئے تو خفا ہو جائیں گے اور "اعظم گڈھ" اور اس کے تمام "متعلقات" پر ایک ہی ساتھ برس پڑیں گے۔

سب سے پہلے انھیں یہ دیکھنا تھا کہ کفار و مشرکین کے حبط اعمال کے متعلق جو آیات ہیں ان کے اسلوب بیان میں اور اس آیت کے اسلوب بیان میں نہایت نمایاں فرق ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ صرف اتنی ہی بات ان کو اصل حقیقت تک پہنچا دیتی اور وہ ایک ایسی بات کے کہنے سے بچ جاتے جس کو عربی زبان کا ایک معمولی طالب علم بھی سنے گا تو اپنی ہنسی کو ضبط نہ کر سکے گا۔ اور افسوس ہے کہ اس بارے میں پرویز صاحب کی غلطی کا الزام قرآن کے اردو مترجمین کے سر بھی نہیں تھوپا جا سکتا ہے، ان بیچاروں نے آیت کے تمام مقدرات کھول دیئے ہیں جو سمجھنے والوں کے لئے کافی ہیں۔ باقی وہ مدرس بنکر سبق تو پڑھانے سے رہے!

پرویز صاحب کی نظر صرف لفظ حبط پر گئی اور انھوں نے سمجھا کہ مطلب کی بات ہے اس کو

Scanned by CamScanner

ٹانک لینا چاہئے۔ حالانکہ عربی زبان اور بالخصوص قرآن مجید میں ایک نہایت اہم چیز اس کے اسالیب ہیں جن میں طلبہ کو مدت تک سر کھپانا پڑتا ہے اور جو لوگ اجتہاد اور جدید نظریات پیش کرنے کے شائق ہوں ان کے لئے ضروری ہے کہ ان سے آشنا ہوں

اصل مسئلہ کو سمجھنے سے پہلے ایک تمہید اجمالاً پیش نظر رکھئے۔

بعض امور کی ابتدا بظاہر معمولی ہوتی ہے۔ لیکن ان کے آخری نتائج نہایت خوفناک ہوتے ہیں۔ ایسے امور کو عام لوگ ہیچ سمجھکر ان کی کوئی پروا نہیں کرتے لیکن حکیم ان کے آغاز ہی میں ان پر گرفت کرتا ہے کہ مبادا یہی قطرہ دریا بنجائے۔ اور پھر اس کے سیلاب میں ایک عالم غرق ہو جائے۔ سعدی کا مشہور مصرع بہتوں کو یاد ہوگا۔

سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل

عرب باوجودیکہ جاہل اور غیر متمدن تھے لیکن اس نکتہ کو ہمارے مجتہدین سے اچھا سمجھتے تھے۔ ان کا کلام اس مضمون کے اشعار و نصایح سے مملوء ہے اور حماسہ کا مصرع تو شاید ہی کسی طالب العلم کو یاد نہ ہو۔

یہیج کبیرات الامور صغیرہا

فطرت کے اسی اصول پر قرآن مجید نے بعض جگہ اپنی عظیم الشان تعلیمات کا آغاز ایسے واقعات سے کیا ہے جو بظاہر نہایت معمولی معلوم ہوتے ہیں۔ سورہ تحریم کی ابتدا میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ بظاہر کس قدر معمولی نظر آتا ہے لیکن چونکہ وہ ایک خطرناک نتیجہ کی طرف منجر ہو سکتا تھا یعنی بعد میں اس سے تحریم و تحلیل کے اس آزادانہ طرز عمل کی بنیاد پڑ سکتی تھی جس سے پچھلی قومیں برباد ہوئی ہیں اس لئے اس کے متعلق خدا کی طرف سے سخت تنبیہ نازل ہوئی۔ قرآن مجید میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ خوف طوالت مانع تفصیل ہے۔ انفال کی ابتدائی آیتیں غور سے پڑھئے۔ اور جی چاہے تو حضرت موسٰی کے پہاڑ پر جانے کا واقعہ بھی۔ اس کے بعد اس آیت کے مفہوم پر غور کیجئے اور سب سے

Scanned by CamScanner

پہلے "اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُکُمۡ" کے اسلوب پر تدبر فرمائیے۔ بالخصوص حرف "اَنۡ" کے پیش و عقب پر۔ اسی تل کے اوٹ میں پہاڑ ہے۔

یہ اسلوب عربی زبان میں بہت عام ہے۔ اور قرآن مجید میں تو اسقدر ہے کہ اگر اندیشہ ہوتا کہ آپ کے سوا اس اسلوب سے بعض دوسرے بھی بیخبر ہونگے تو الاصلاح میں اس پر ایک مضمون لکھدیا جاتا۔ اس قسم کی ترکیب میں "ان" سے پہلے کوئی مناسب مقام لفظ محذوف ہوتا ہے۔ اہل نحو اس محذوف کی تعیین موقع و محل کی مناسبت سے رجاء و تحذیر کے مختلف الفاظ سے کرتے ہیں۔ مثلاً اس موقع کے لئے مخافۃ، کراہتہ یا اس کے ہم معنی الفاظ اختیار کرلیں گے۔ پس "اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُکُمۡ" کا مفہوم یہ ہوگا کہ جس امر سے تم کو روکا گیا ہے اس سے روکنے کی وجہ یہ ہے کہ اگر تم اس سے باز نہ رہے تو مبادا تمھارا یہ فعل ایسی برائی تک منجر ہو کہ تمھاری تمام اعمال حبط ہو جائیں۔ یہ نہیں کہ بعینہ یہی فعل سبب حبط عمل ہے۔ براہ کرم ان آیتوں کو پیش نظر رکھئے جن میں کفر و شکر کو حبط عمل کا قطعی سبب بنایا گیا ہے۔ مثلاً (۱) لَوۡ اَشۡرَکُوۡا لَحَبِطَ عَنۡهُمۡ مَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ" نبی سے خطاب ہے۔ (۲) لَئِنۡ اَشۡرَکۡتَ لَیَحۡبَطَنَّ عَمَلُکَ وَلَتَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ۔ (۳) مَنۡ یَّرۡتَدِدۡ مِنۡکُمۡ عَنۡ دِیۡنِهٖ فَیَمُتۡ وَهُوَ کَافِرٌ فَاُولٰٓئِکَ حَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ۔ کیا آپ کے نزدیک آیت زیر بحث اور ان آیات میں کوئی فرق نہیں ہے؟ اگر آپ قرآن کے اردو ترجموں میں بھی دیکھیں گے تو محسوس کریں گے کہ ایک میں قطعی فیصلہ ہے ایک میں خطرہ سے تحذیر ہے کہ تمھارا یہ فعل حبط عمل تک منجر ہو سکتا ہے۔ مگر چونکہ آیت میں یوں نہیں کہا گیا کہ "خطرہ ہے کہ تمھارے اعمال حبط ہو جائیں" اس لئے آپ نے سمجھ لیا کہ نفس رفع صوت فوق صوت النبی ہی حبط عمل کا سبب ہے۔ مگر آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جو لوگ عربی زبان سے واقف ہیں وہ بغیر کسی نوٹس کے اس خطرہ کو سمجھتے ہیں۔ مگر آخر آپ نے اردو ترجموں پر کیوں نہیں غور فرمایا! ممکن ہے آپ نے مقدر کی توضیح کو توسین کے اندر دیکھکر سمجھا ہو کہ یہ بیچ میں مترجم نے کوئی "روایتی مسلک

رکھ دیا ہے اور اسی لئے اس کو چھوڑ گئے ہوں۔ وہ مثل ہے نا کہ دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے؛

افسوس ہے کہ آپ حدیث کے قدرداں نہیں ورنہ ہم آپ کو یہی بات ایک مثال سے سمجھاتے اور پھر ایک حدیث سناتے جس میں وہ مثال بیان ہوئی ہے اور معاملہ کے تمام اسرار کو بے نقاب کر رہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ نبی کی آواز پر آواز بلند کرنے کا کیا مطلب ہے؟ یوں تو آواز بلند کرنے کی جتنی بھی صورتیں ہو سکتی ہیں سب اس کے اندر آ سکتی ہیں۔ اور نبی کے ادب و احترام کا تقاضا ہے کہ ان سب سے اجتناب کیا جائے۔ نبی کی حیثیت عام انسانوں کی نہیں۔ ہم پر اپنے عام معلم اور استاد کی تعظیم بھی واجب ہے۔ پھر اس ذات کے احترام کا کیا پوچھنا ہے جو خدا کی طرف سے تمام عالم کی معلم بنا کر بھیجی گئی ہے۔

لیکن موقع سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رفع صوت سے مناظرہ و مجادلہ کی طرف اشارہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے تھے جو اپنی رایوں کو بہت وقیع سمجھتے تھے اور نبی کریم سے بات بات پر گستاخانہ بحث کر بیٹھتے تھے۔ عام طور پر یہ طریقہ منافقین کا تھا کہ ان کا مقصود ہی نبی کی توہین و دل آزاری تھا لیکن ممکن ہے کہ کمزور ایمان کے مسلمان بھی کبھی کبھی ایسا کر جاتے رہے ہوں اس لئے یہ نہی نازل ہوئی کہ مسلمان اس فعل کے آخری نتائج سے واقف ہو جائیں۔ حسن سے مروی ہے۔

نزلت فی المنافقین کانوا یرفعون	یہ آیت منافقین کے بارہ میں نازل ہوئی وہ لوگ
اصواتهم فوق صوت رسول الله	اپنی آواز ان کو نبی کی آواز پر اہانت کے خیال سے
صلی الله علیه وسلم استخفافا و استهانة	بلند کرتے تھے تاکہ یہ کمزور ایمان کے مسلمان انکی
لیقتدی بهم ضعفة المسلمین فنهی	پیروی کریں۔ پس مسلمانوں کو اس سے روک
المسلمون عن ذلك	دیا گیا۔

اس سے قبل کی آیت لا تقدموا بین یدی الله و رسوله سے بھی اس خیال کی

تائید ہوتی ہے اور مزید تائید اس سورہ کی ایک اور آیت سے ہوتی ہے

وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِیْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ	اور جان لو کہ تمہارے اندر خدا کا رسول ہے
لَوْ یُطِیْعُكُمْ فِیْ كَثِیْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ	اگر وہ بہت سے امور میں تمہاری پیروی کرتا تو تم تنگی میں پڑ جاتے

"یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" میں خطاب اگرچہ عام ہے لیکن ظاہر ہے کہ تمام مسلمان اس سے مراد نہیں ہو سکتے بلکہ راسخ الایمان مسلمانوں کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ	یقیناً وہ لوگ جو اپنی آوازوں کو خدا کے رسول کے
رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ	یہاں پست کرتے ہیں وہی لوگ ہیں جن کے دلوں
امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰی	کو خدا نے تقویٰ کے لئے پرکھ لیا ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ رفع صوت عند النبی تقویٰ کے منافی ہے اور چونکہ تقویٰ ہدایت کا سرچشمہ ہے اسلئے جو لوگ نبی کے سامنے آواز بلند کرینگے وہ ہدایت سے محروم ہو جانے کے مستحق ہوں گے۔

الغرض یہاں یاایہا الذین امنوا کے خطاب عام کا روئے سخن اصلاً ضعیف الایمان مومنین کی طرف ہے۔ اسی قسم کے مومنین کی ایک جماعت کا ذکر اس سورہ کے اخیر میں ہے۔

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا	اعراب نے کہا کہ ہم ایمان لائے (اے نبی) کہدو تم لوگ
وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا	ایمان نہیں لائے بلکہ تم لوگ کہو ہم اسلام لائے۔

سورہ حدید کی ایک آیت میں الذین امنوا کے عام لفظ سے ضعیف الایمان مسلمانوں کو مراد لیا ہے

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ	کیا مسلمانوں کے لئے ابھی یہ وقت نہیں آیا کہ
قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ	خدا کے ذکر کیلئے اور اس حق کیلئے جو نازل ہوا

Scanned by CamScanner

ولا یکونوا کالذین اوتوا الکتاب	ان کے دل گداز ہوں۔ اور ان لوگوں کی طرح
من قبل فطال علیھم الامد	نہ ہو جائیں جنکو اس سے قبل کتاب دی گئی تو ان پر
فقست قلوبھم الایہ	مدت دراز ہو گئی اور ان کے دل سخت ہو گئے

پرویز صاحب فرمائیں گے کہ دیکھئے بے دلیل و سند یا ایھا الذین امنوا سے ضعفاء قلوب کو مراد لے لیا حالانکہ کسی ترجمہ میں ایسا نہیں لکھا گیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس مسئلہ کا تعلق وجوہ خطاب سے ہے جو منجملہ ابواب وجوہ دلالت قرآن کے ہے اور اس پر یہاں بحث کی گنجائش نہیں۔ خود آیت زیر بحث کے ابھی بعض نہایت مفید پہلو اس قابل تھے کہ ان کی طرف اشارہ کر دیا جائے لیکن خوف طوالت مانع ہے۔

اس کے بعد پرویز صاحب نے میرے اس فقرہ پر کہ "البتہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر گناہ کی سزا ہونی چاہیئے"، لکھا ہے کہ "یہاں مولوی صاحب پھر الجھن میں پھنس گئے"۔ اچھا صاحب ہم الجھن میں پھنس گئے لیکن آپ تو شب تاریک اور بیم موج کے تمام اندیشوں سے فارغ تھے۔ پھر آپ کو کیا ہوا تھا کہ اس کے بعد ہی کی یہ عبارت آپ کو نظر نہ آسکی" اس لئے کہ جو گناہ توبہ سے معاف ہو گئے یا جنکو حسنات نے مٹا دیا ان کی سزا نہیں ہو گی ہاں جو گناہ ایسے ہیں کہ بغیر توبہ معاف نہیں ہو سکتے اگر انکا کوئی مرتکب ہو اور توبہ نہ کرے تو یقیناً سزا کا مستحق ہو گا ...."

کہیں آپنے اپنے نجات کے ارتقائی تخیل میں تو بحث و نظر کے زینوں کو اسی طرح نہیں طے کیا ہے!

(۴) بچوں کے دخول جنت کے متعلق میں نے یہ عرض کیا تھا کہ بلا شبہ اسکے متعلق قرآن مجید میں کوئی صریح آیت نہیں ہے اور نہ یہ کوئی اصولی مسئلہ ہے۔ البتہ اشارات ملتے ہیں اور اس کے لئے اشارات کافی ہیں اور اسی ضمن میں سورہ طور کی آیت والذین امنوا واتبعتھم ذریتھم بایمان" الایہ پیش کی تھی اور اس سے اس طرح پر استدلال کیا تھا کہ اس آیت میں مذکور ہے کہ

مومنوں کی صالح اولاد کو جنت میں ان کے ساتھ کر دیا جائے گا۔ اور ان سب کو ایک ہی درجہ میں رکھا جائے گا گو عمل کے لحاظ سے اولاد کا درجہ فروتر ہو۔ اور ایسا محض جنتیوں کی تکمیل مسرت کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و احسان سے کرے گا۔ پھر جب محض جنتیوں کی تکمیل مسرت کے لئے اللہ تعالیٰ اپنے فضل و احسان سے ان کی صالح مومن ذریت کو جا ہے وہ جنت کے فروتر درجہ میں ہو اونچے درجہ میں پہونچا دے گا تو اگر چھوٹے بچے بھی محض اپنی والدین کی تکمیل مسرت کے لئے بطور فضل و بخشش ان کے ساتھ کر دئے جائیں تو ایسا ہونا اقرب ہے جب کہ یہ بھی معلوم ہے کہ جنت میں اہل ایمان جو آرزو کریں گے وہ پوری کی جائے گی۔ یہ میرا خیال تھا جو مذکورہ بالا آیت سے میں نے سمجھا تھا اور اس کی تائید میں جنازہ والی دعا پیش کر کے عرض کیا تھا کہ احادیث سے بچوں کے جنت میں جانے کی یہی وجہ معلوم ہوتی ہے لیکن پرویز صاحب نے اس پر چند اعتراضات وارد کئے ہیں۔ اول اعتراض یہ ہے کہ ہم نے ذریت کے معنی اولاد کے لئے ہیں حالانکہ اس کے معنی اولاد اور اولاد در اولاد کے آتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ایک غیر متعلق بحث چھڑ جائے گی ورنہ ہم ان کو بتلاتے کہ اولاد در اولاد کے کیا معنی ہیں اور ذریت کے لفظ میں یہ مفہوم کیسے آتا ہے لیکن زائد بحث میں پڑنے سے زیادہ بہتر یہی ہے کہ ہم تسلیم کرلیں کہ یہ لفظ دونوں معنوں میں مستعمل ہے۔ چونکہ اولاد کے معنی اختیار کرنے میں کوئی خرابی نہیں تھی اس لئے ہم نے اسے اختیار کر لیا۔ اور یہی تمام مفسرین اور مترجمین نے اختیار کیا۔ لیکن اگر پرویز صاحب کو اصرار ہے تو خیر اولاد در اولاد ہی کے معنی سہی میرے مدعا کو اس سے کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔ اس لئے کہ میرے نزدیک یہ اجتماع ذریت ہی تک محدود نہیں ہوگا بلکہ اس میں آباء، ازواج سبھی شامل ہوں گے جیسا کہ قرآن پاک کی اور دیگر آیات سے معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "آیت میں ذریت کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ایمان لائے۔

Scanned by CamScanner

انھوں نے اتباع کی اور یہ کہ اللہ ان کے اعمال میں کمی نہ کرے گا پھر اس سے نابالغ غیر مکلف بچے کس طرح مراد لئے جا سکتے ہیں"۔ معلوم نہیں پرویز صاحب نے کیسے سمجھ لیا کہ میں نے ذریت سے مراد نابالغ بچے لئے ہیں۔ میں نے تو بالکل واضح طور پر مومن و صالح اور سیانی اولاد کا لفظ لکھا ہے اور پھر میرے استدلال کی نوعیت ہی بتا دے سکتی ہے کہ میں نے نابالغ بچوں کو مراد نہیں لیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی سوچنا چاہئے تھا کہ اگر میرے نزدیک ذریت سے نابالغ بچے مراد ہوتے تو یہ آیت تو اس باب میں بالکل نص صریح ہو جاتی ۔۔۔ اس سے مجھے اشارات مستنبط کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ پرویز صاحب سے اس آیت کے سمجھنے میں ایک اور چوک بھی ہو گئی ہے وہ یہ کہ "وما التناھم من عملھم من شیء" کو وہ ذریت سے متعلق سمجھتے ہیں اور غالباً اس سے ان کا منشا یہ ہے کہ یہ لوگ مومنین کے ساتھ مزید فضل الٰہی کے طفیل میں نہ ہوں گے ، اپنے اعمال کے استحقاق کی بنا پر ہوں گے۔ لیکن ہمارے نزدیک اس کا تعلق مومنین سے ہے ذریت سے نہیں ہے۔ یہی عام طور پر مفسرین کی بھی رائے ہے۔ رسول اللہ صلعم سے جو تفسیر مروی ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

پھر نفس آیت اور موقع و محل کا تقاضا بھی یہی ہے۔ یہاں ان نعمتوں کا ذکر ہے جن سے مومنین کو جنت میں نوازا جائے گا اور منجملہ ان نعمتوں کے یہ ذریت کا الحاق و اجتماع بھی ہے۔ لیکن یہاں ایک شبہہ ناشی ہوتا تھا کہ ممکن ہے کہ اس الحاق کے لئے ذریت کے نقص عمل کی تلافی ان کے بزرگوں کے عمل سے کی جائے تو اللہ تعالیٰ نے اس شبہہ کو دفع فرمایا کہ ایسا نہیں ہوگا یہ محض فضل و احسان ہوگا، مومنین کے اعمال میں کوئی کمی نہ کی جائے گی۔ یہ گویا بطور دفع دخل مقدر ہے۔ دوسرے یہ کہ آیت میں الحاق کا لفظ ہے۔ اور اگر مان لیا جائے کہ وہ محض اپنے اعمال کے صلہ میں اپنے بزرگوں کے درجہ میں ہوں گے تو ان کی خود مستقل حیثیت ہوئی۔ یہ الحاق نہ ہوا۔

خلاصہ یہ کہ اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ مومنین کی اولاد جو اپنے عمل کی کمی کی وجہ سے

Scanned by CamScanner

ان سے فروتر ہوگی۔ بطور فضل خداوندی اور تشریف و تکریم ان کے ساتھ کر دیجائے گی۔ تاکہ ان کی مسرت کامل ہو۔ میں نے اسی پر چھوٹے بچوں کے متعلق اپنے استدلال کی بنیاد قائم کی کہ جب ذریت کے باب میں اس فضل و رعایت کا سراغ لگتا ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ کمسن بچوں کو بھی ان کے والدین کی تکمیل مسرت کے لئے ان کے ساتھ کر دے گا۔ گو وہ اپنے عمل کے اعتبار سے جنت کے مستحق نہ ہوں۔

پھر اسی ذیل میں میں نے ایک اور بات بھی لکھی تھی کہ "بہشت میں جو آرزو کی جائیگی پوری ہوگی۔۔۔۔۔ اسلئے اللہ تعالیٰ مومنین کی اس آرزو کو کہ انکی اولاد ان کے ساتھ کردیجائے انکی تکمیل مسرت کیلئے پوری کردے گا۔"

اس پر پرویز صاحب پر لطف معارضہ فرماتے ہیں۔

"کیا عمدہ استدلال ہے۔ اور اگر کسی کی وہاں یہ آرزو ہو کہ اس کے فلاں دوست یا اسکی بیوی کو تکمیل مسرت کے لئے اس کے ساتھ کر دیا جائے تو ان سب کو دوزخ سے نکالکر جنت میں بھیج دیا جائیگا۔"

جواب میں گذارش ہے کہ قرآن کا وعدہ تو یہی ہے کہ جنت میں جو خواہش کی جائے گی وہ پوری ہوگی ولکم فیہا ما تشتھون ولکم فیہا ما تدعون

یہ تو قرآن کی آیتیں ہیں۔ کوئی روایتی مسلک تو ہے نہیں کہ آپ بے تامل انکار کر دیں گے۔ مگر معلوم ہوتا ہے آپ حضرات قرآن کو بھی اسی وقت تک مانتے ہیں جب تک وہ آپکے مزعومہ مسلک کی حمایت کرے اور جماعت کے مشن سے ہم آہنگ ہو ورنہ اس کے انکار میں بھی چنداں مضایقہ نہیں ہے۔ تعجب ہے آپنے جنت کی زندگی کو بالکل اپنی زندگی پر قیاس فرمایا۔ حالانکہ وہ زندگی بالکل مختلف ہوگی۔ وہاں ہر جائز و ناجائز چیز کی آرزو نہیں کی جائے گی۔ غور فرمائیے! جن چیزوں سے ایک مومن اپنی دنیاوی زندگی میں نفرت کرتا تھا یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ ان کی آرزو اس زندگی میں کرے جو بالکل پاک اور خالص زندگی ہوگی۔ سورہ نور غور سے پڑھیئے۔ اس میں ایک آیت ملے گی جس میں مومن کے گھرانے اور اسلام کی سوسائٹی کی تصویر کھینچی گئی ہے اور اس کے بعد

سوچئے کہ جس مقدس گھرانے کے افراد دنیا میں پاکی اور طہارت کے اس رتبہ پر ہیں وہ جنت میں یہ کیسے آرزو کریں گے کہ فلاں عورت دوزخ سے نکال کے ان کے ساتھ کر دی جائے۔ معلوم نہیں آپ نے ایمان کو کیا چیز سمجھ رکھا ہے جس کے ہوتے ہوئے یہ تمنائیں بھی باقی رہیں گی۔ جس ایمان نے بدر میں باپ کی تلوار بیٹے کی گردن پر چلوا دی۔ جس نے بھانجہ کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین کرا دی۔ جس نے حضرت نوحؑ کے بیٹے کو ان کے خاندان سے خارج کر دیا۔ اِنَّہٗ لَیْسَ مِنْ اَھْلِکَ اِنَّہٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ۔ جس نے حضرت ابراہیمؑ کو باپ کے لئے دعائے استغفار سے روک دیا، جس نے رحمۃ للعالمین سے اپنے چچا کے خلاف اعلان برأت کرایا اور جس کی بے پناہی کا یہ عالم ہے کہ قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ کیا اس ایمان کے ساتھ آپ کو یہ بھی خیال ہے کہ کسی زانیہ، فاحشہ اور دوزخی عورت کی محبت بھی جمع ہو جائے گی اور وہ بھی جنت میں پہنچکر؟ کیا قرآن کو سمجھنے کے لئے "روایتی مسلک" سے آزاد ہونے کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی کا مذاق سلیم ایسا ہو کہ اس طرح کی باتیں لکھدینے سے اس کا قلم ذرا بھی نہ جھجکے۔!! انا للہ

بہرحال آپنے یہ ایسی بات لکھدی کہ جس کے بعد آپ سے کسی علمی مسئلہ پر گفتگو بے محل معلوم ہوتی ہے۔ تاہم عرض کرتا ہوں کہ اہل ایمان کا رشتہ محبت دنیا ہی میں اہل کفر و شرک سے منقطع ہو جاتا ہے۔ پس وہ جنت میں بدرجہ اولی ان کے ساتھ یکجائی کی درخواست نہیں کریں گے۔ لیکن کمسن بچوں کا معاملہ بالکل مختلف نوعیت و حالت رکھتا ہے۔ وہ کفر و فسق کی آلودگی سے کوسوں دور معصومیت کے گود میں کھیلتے ہوئے اس دنیا سے چلے جاتے ہیں اور اپنے والدین کے دلوں میں ایک زخم چھوڑ جاتے ہیں۔ پس ہو نہیں سکتا کہ جنت میں یہ داغ محبت نہ ابھرے اور ارحم الراحمین اس پر مرہم نہ رکھے۔

آپ کو سوچنا چاہئے تھا کہ کافروں اور فاسقوں کے لئے تو جنت میں جانے کے لئے ایک مانع موجود ہے لیکن بچوں کے لئے کیا مانع ہے؟ ان کے لئے صرف داعی کی ضرورت تھی اور مومن باپ اور مومنہ ماں سے بڑھکر کون داعی ہو سکتا ہے! اسی لئے میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ بچوں کا جنت میں جانا تبعاً ہوگا۔

"انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جہنم الآیۃ"

اس آیت میں ہم نے "ما تعبدون" سے اصنام مراد لئے تھے اس لئے کہ قرائن اسی کے مقتضی تھے۔ چنانچہ "ما تعبدون" اور "الہہ" عام طور پر اصنام ہی کیلئے آتے ہیں، متبوعین کیلئے نہیں۔ لیکن پرویز صاحب اس کو عام مانتے ہیں اور ہم کو اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ ہمارا مدعا اس صورت میں بھی ثابت ہے۔ کیونکہ اس عام کے اندر اصنام بھی داخل ہوں گے اور یہی مقصود ہے۔

غرض اندر میاں سلامت اوست

(۴) اعراف کی جماعت پر مجھے اعتراض نہیں ہے اسکا ذکر قرآن میں ہے اس پر اعتراض کی کہاں گنجائش ہے! سوال جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ آپکے اصول ارتقاء کے مطابق ان کو جنت میں جانے کا حق کیسے ہوا، انکی سیئات حسنات سے دبی نہیں۔ ان کے اندر صلح باہم کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی۔ دنیا عمل کی جگہ تھی، اس میں وہ منزل مقصود تک پہنچے نہیں۔ اب آخرت عمل کی جگہ نہیں کہ آگے بڑھ سکیں۔ پھر ان کو آپ کے اصول کے مطابق جنت میں جانے کا کیا حق ہے!! اور اگر وہ جنت میں گئے تو یقیناً وہ آپکے فلسفہ کے حدود کو توڑ کر جائیں گے اور غور فرمایئے یہ کتنی درد انگیز بات ہوگی کہ جس فلسفہ کو آپ ہی نے دنیا میں پہلی مرتبہ قائم کیا وہ آپ ہی کی قائم کی ہوئی ایک جماعت کے ہاتھوں برباد ہو کے رہ جائے!!

پھر یہ کس دلیل سے آپ نے معلوم کیا کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے اعمال صالحہ اور سیئات برابر

ہوں گے ایسے لوگوں کا ذکر تو اس موقع پر ہونا تھا جہاں وزن اعمال کا ذکر ہے۔ لیکن وہاں بھی اس بات کا کوئی مذکور نہیں جہاں اس جماعت کا ذکر ہے۔ کہیں اس کی بنیاد آپ نے ظن پر تو نہیں قائم کر لی ہے۔ مگر ایسا کاہے کو ہوگا۔ ظن سے تو آپ لوگوں کو بڑی نفرت ہے!

اب آخر میں فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهُ فَأُولَٰئِكَ الَّذِينَ خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ الاٰیہ پر غور کرنا چاہئے کہ درحقیقت پرویز صاحب کے نظریہ کی اصل بنیاد یہی ہے۔

میں نے اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ "یہ بالکل صحیح ہے کہ اصل میں دو ہی جماعتیں ہیں۔ ایک خدا اور رسول کی ماننے والی اور دوسری منکر۔ اور باعتبار نتیجہ کے ایک کے لئے جنت ہے اور دوسری کیلئے دوزخ۔ اس لحاظ سے ایک مدت تک سزا جھیل کر جنت میں جانیوالی کوئی تیسری جماعت نہیں کہ حقیقۃً وہ بھی خدا اور رسول کے ماننے والوں میں شامل ہے اور بالآخر وہ جنت ہی کی مستحق ہوگی۔ اور چونکہ یہ ایک ضمنی جماعت ہے اس لئے جہاں قرآن نے اصولی تقسیم کی ہے وہاں اسکا ذکر ضروری نہیں سمجھا"۔ اس لئے اس آیت کے متعلق ایک علیحدہ بحث کی ضرورت نہیں سمجھی کیونکہ اس آیت میں یا اس قسم کی دوسری آیات (مثلاً جس میں اعمالنامہ کے دہنے اور بائیں ہاتھ میں ملنے کا ذکر ہے) یہی اصولی تقسیم پیش نظر ہے۔ کوئی تفصیل نہیں کی گئی ہے۔ ورنہ یہ ضروری تھا کہ ان مواقع پر اعراف والی تیسری جماعت کا بھی ذکر ہوتا۔ لیکن اس کا ذکر نہیں ہے اور کچھ نہیں معلوم کہ اس کو جب اعمالنامے ملیں گے تو اس کی صورت کیا ہوگی۔ حالانکہ یہ جماعت دہنے ہاتھ اور بائیں ہاتھ میں اعمالنامے پانے والی دونوں جماعتوں سے یقیناً ایک الگ حالت رکھے گی۔ مگر اس کی تفصیل نہیں کی گئی کیونکہ یہاں ان جزئیات کی تفصیل کا محل نہ تھا صرف ایک اصولی اور کلی تقسیم پیش نظر تھی۔

اس آیت کا اعادہ سورہ اعراف اور سورہ زلزال میں بھی ہوا ہے۔ ان تمام مواقع کے مطالعہ سے

یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام طور پر اس کا جو مطلب سمجھا جاتا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ یعنی میزان کی ثقل و خفت اعمال صالحہ کی کثرت و قلت کی تعبیر نہیں ہے بلکہ اعمال کے نافع اور غیر نافع ہونے کی تعبیر ہے۔ جس کے اعمال مفید اور کارآمد ہوں گے اس کے پلڑے بھاری ہوں گے جبکے اعمال شرک و کفر کی وجہ سے کھوکھلے ہوں گے ان کے پلڑے ہلکے ہوں گے۔ ان میں سے پہلی جماعت اہل ایمان کی ہوگی کہ ان کے ایمان نے ان کے اعمال میں وزن پیدا کر دیا ہوگا اور دوسری جماعت کفار و مشرکین کی ہوگی کہ کفر و شرک کی وجہ سے ان کے اعمال بالکل بے وزن ہوں گے۔ انہی منکرین کے متعلق سورہ کہف میں ہے

اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ	وہ لوگ جنھوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیات کا اور
وَلِقَآئِہٖ فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُہُمۡ فَلَا نُقِیۡمُ	اس سے ملنے کا پس ان کے اعمال ڈھ گئے
لَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَزۡنًا	ان کے لئے قیامت کے دن کوئی وزن نہ ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کفار کے اعمال میں کوئی وزن نہ ہوگا اور اسی بے وزنی کو زیر بحث آیت میں خفت میزان سے تعبیر کیا ہے۔ ورنہ اگر فمن خفت موازینہ سے وہ لوگ مراد ہوتے جن کے اعمال حسنہ اعمال سیئہ سے کم ہوں گے تو اس موقع پر الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ وَلِقَآئِہٖ کی صفت کے ساتھ ان کے ذکر کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو ایک عام بات ہوتی جس کا فرد مومن دونوں اس کی زد میں آتے۔ مگر معلوم ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اعمال کی حیثیت روح ایمان سے قائم ہوگی۔ جس کے پاس ایمان ہوگا ان کے اعمال میں وزن ہوگا اور جو ایمان سے خالی ہوں گے ان کے اعمال بالکل بے وزن ہوں گے۔ پس آپ کا یہ سمجھنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ خدا کے یہاں بھی آپ کے اسکولوں کی طرح گنتی اور عدد پر کامیابی اور نجات کا فیصلہ ہوگا۔ اور وہاں کی میزان ایسی ہی اندھی ہوگی جیسی آپ کے ہاتھ میں ہے کہ کوئلے اور اشرفیوں دونوں کو برابر تول دے گی

ادبیات

کلام سہیل

از جناب مولوی اقبال احمد صاحب سہیل ایم اے ال ال بی علیگ

نوید نو بہار آئی گھٹا چھائی ہے گلشن پر
اسیران قفس قابض ہوئے شاخ نشیمن پر

نظر برق تپاں کی جب سے ہے میرے نشیمن پر
برستی ہے ادا سی سی تجلی گاہ ایمن پر

سزا فریاد کی ہے یا کرم ہے میرے شیون پر
قفس اب بھی وہی ہے گرچہ ہے شاخ نشیمن پر

بڑھائے جاتے ہیں ہر روز حلقے دام گیسو کے
مگر صیاد کا احسان ہے پھر بھی اپنی گردن پر

نہیں اذن فغاں بھی رخصت پرواز کیا ہوتی
قفس والے بھی کھاتے ہیں ترس میرے نشیمن پر

ترے مشتاق ہیں مدت سے بزم راز کے پردے
بس اے دست جنوں یہ مشق تا کے جیب و دامن پر

تماشا گاہ موسیٰ کے بھی ٹکڑے جب لے گرد اہلے
وہ بجلی کوندتی ہے اب سواد دشت ایمن پر

انہی تنکوں سے وابستہ میری تاریخ ہستی ہے
فدا کروں دو عالم اپنے خاشاک نشیمن پر

بہار داغ عصیاں دیکھ کر دامان رحمت میں
فرشتوں کی نظر اٹھتی ہے مجھ آلودہ دامن پر

نہیں اب کارگر کوئی فریب حسن کا افسوں
مدار اک رہ گیا ہے فتنۂ شیخ و برہمن پر

مرا ذوق تنظر خوگر ہے منظر کی بلندی کا
کروں کیوں ان سے جلوے کا تقاضا دشت ایمن پر

یہ حاصل ہے سہیل خستہ اپنی سعی حاصل کا
کدھر آرزو ہے التفات برق خرمن پر

تلخیصات

فلسطین

(یہ مضمون مسٹر عبد الحکیم اعظمی نے ہندوستان ٹائمز سے تلخیص کر کے عنایت فرمایا ہے - اڈیٹر)

دوران جنگ میں قوموں میں جو معاہدے ہوتے ہیں عموماً وہ دیرپا نہیں ہوتے - ان کا ہیولیٰ تیزی سے بدلنے والے حالات کے اندر تیار ہوتا ہے اس لئے ان کی بنیادیں کھوکھلی رہجاتی ہیں - ۱۹۱۵ء میں برطانیہ نے چاہا کہ ترکوں کا تختہ الٹ دے - اس کے لئے عربوں کی حمایت کی ضرورت تھی - پس ان کو ہموار کرنے کے لئے جھٹ ہی ان سے وعدہ کرلیا گیا کہ تمھیں مکمل آزادی دیدی جائے گی - ساتھ برطانیہ کو یہودی سرمایہ اور امریکہ کے اخبارات کی اعانت کی بھی ضرورت تھی چنانچہ یہودیوں سے وعدہ کرلیا گیا کہ فلسطین کو ہم تمھارا قومی وطن بنادیں گے - عرب آزادی کے عشق میں ایسے کھوئے گئے تھے کہ فوراً برطانیہ کے دام فریب میں آگئے، لیکن یہودی مہاجن قوم ہیں انھوں نے معاملہ چکانے سے پہلے ایک دستاویز کا مطالبہ کیا جو ضرورت کے وقت کام آوے -

رائل کمیشن، جس کی رپورٹ حال ہی میں شائع ہوئی ہے اس نے بیس سال ادھر کے دستاویزات اور معاہدوں کی چھان بین میں سر کھپانا ضروری نہیں خیال کیا ہے - اس کے نزدیک دنیا کا منہ بند کرنے کے لئے یہ دلیل بالکل کافی ہے کہ برطانوی حکومت نے عربوں کے مطالبات کبھی صحیح تسلیم نہیں کئے -

گویہ انتہائی بدبختی کی بات ہے کہ برطانوی حکومت زمانہ جنگ کی کشمکش میں اپنا ارادہ تفصیل و وضاحت کے ساتھ شریف مکہ سے بیان نہ کرسکی لیکن ابہام و اجمال بھی سیاسی تدبر کا ایک ضروری عنصر ہے - اسلئے نہ تو اس پر افسوس کرنا چاہئے نہ تعجب!

Scanned by CamScanner

۱۹۱۵ء میں انگریزوں کیلئے عربوں کی حمایت بڑی قیمتی چیز تھی۔ ترکوں کے خلاف پروپگنڈے کی جو آگ بھڑکائی گئی تھی اس کیلئے بہترین ایندھن عرب ہی ہو سکتے تھے۔ اسلئے ضروری ہوا کہ انکو زیادہ سے زیادہ قیمتی وعدوں کے ذریعہ خوش رکھا جائے چنانچہ مصر کے ہائی کمشنر سر ہنری میکموہن نے عربوں کے جذبات آزادی کو اور زیادہ شہ دی، انھوں نے ۲۵ اکتوبر ۱۹۱۵ء کے ایک خط میں جو شریف مکہ کے نام لکھا تھا، آزاد عرب کا ایک جلوہ دکھانے کی کوشش کی لیکن وہ خط حکومت کی طرف سے کبھی شائع نہیں ہوا اور یہ بتلانے کی مطلق ضرورت نہیں ہے کہ انگریز اپنے مفاد کے خلاف کسی قول و قرار کی پابندی ضروری نہیں سمجھتے اس خط کی رو سے ترکی ولایت اور نہ حلب و دمشق کے مغرب کے شامی اضلاع حدود عرب سے خارج سمجھے گئے۔ اس کے بعد مسٹر ونسٹن چرچل نے اس بنا پر کہ فلسطین سیریا سے ملحق ہے نہ صرف بیروت اور بیت المقدس کو بلکہ دریائے یردن کے مغرب کے تمام علاقہ کو ممالک عرب سے بالکل خارج قرار دیدیا۔ (یادداشت مورخہ ۳ جون ۱۹۲۲ء) اس یادداشت سے برطانوی حکومت کا منشا معلوم ہو گیا۔ دوسری طرف ہنری میکموہن کے وعدوں کے بعد ہی برطانیہ اور فرانس میں خفیہ معاہدے ہونے لگے۔ بالآخر یہ خفیہ معاہدے سائکز پیکاٹ (Sykes Picot) کے صلحنامہ کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ اس صلحنامہ کی رو سے برطانیہ اور فرانس نے شمالی عرب کو باہم تقسیم کر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور بقیہ عرب کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی صورت میں بدل دینا چاہا۔ نومبر ۱۹۱۷ء تک یہ صلحنامہ عربوں سے پوشیدہ رکھا گیا۔ لیکن روسی انقلاب کے بعد جب بالشویکی حکومت برسر اقتدار ہوئی تو عربوں پر حقیقت حال کھل گئی۔ عرب سخت غضبناک ہوئے۔ مگر اس وقت جب کہ سازش کی رات گذر چکی تھی اور نتائج کی صبح نمودار ہو چکی تھی۔

اعلان بالفور نومبر ۱۹۱۷ء میں برطانوی اور صیہونی گفت و شنید تکمیل کو پہنچ گئی۔ مسٹر بالفور نے جو اس زمانہ میں برطانیہ کے وزیر خارجہ تھے لارڈ روتھ شیلڈ کو لکھا "ہز مجسٹی کی حکومت فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانے کی تجویز کی پرزور حمایت کرتی ہے اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے اپنی

Scanned by CamScanner

پوری کوشش صرف کرے گی، اس امر کی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ فلسطین کی غیر یہودی آبادی کے مذہبی اور تمدنی حقوق یا غیر ممالک کے یہودیوں کے عام حقوق و اختیارات پر کسی قسم کی دست اندازی نہیں کیجائے گی۔

پرمنفعت سودا "قومی وطن" کی تجویز ایک پرمنفعت سودا تھی۔ مسٹر لائڈ جارج نے فرمایا ہے کہ "صیہونی لیڈروں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر دول متحدہ فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانے میں آسانیاں فراہم کرنیکا وعدہ کریں تو ساری دنیا کے یہودی دول متحدہ کی اعانت وحمایت میں ہر ممکن ایثار و قربانی کے لئے تیار ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہود نے اپنا وعدہ پورا کردیا ہے۔"

یہودی ریاست کا تصور فلسطین کو یہود کا قومی وطن بنانے کا واقعی مفہوم کیا ہے؟ اس کے متعلق مدبرین کی رائیں ہمیشہ مختلف رہی ہیں: کچھ سمجھتے تھے کہ فلسطین میں ایک یہودی حکومت کی بنیادیں استوار کیجائیں گی۔ اور بعض اس کا مطلب کچھ اور سمجھتے تھے لیکن ہز مجسٹی کی حکومت نے کبھی اس غلط فہمی کو رفع کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ اس نے ہر قسم کے خیالات اور ہر طرح کی امیدوں کے لئے دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور کبھی تردید یا تصحیح کی زحمت نہیں اٹھائی۔ مسٹر لائڈ جارج نے جو اس وقت وزیر اعظم تھے، اب رائل کمیشن کو ایک بیان دیا ہے فرماتے ہیں "فلسطین میں اکثریت کی خواہش کے علی الرغم دفعتہً کسی یہودی سلطنت کی طرح ڈالدینا ہرگز پیش نظر نہ تھا۔ ابتداء سے یہ خیال تھا کہ جب فلسطین کو ملک کی نمائندہ اور ذمہ دار حکومت عطا کرنے کا وقت آئے گا اور یہود قومی وطن کے تصور کی رہنمائی میں، ملک میں اپنی اکثریت بنا چکے ہوں گے تو فلسطین کی حکومت خود بخود عملی طور پر ایک یہودی کامن ویلتھ کی شکل اختیار کرلے گی۔"

دول متحدہ کے دوسرے سیاسی مفکرین، باوجودیکہ عربوں سے برطانوی معاہدوں کا حال جانتے تھے، زیادہ کھل گئے۔ انھوں نے بھی برطانیہ کی طرح ساری دنیا کو "مہذب" بنانیکا مصمم ارادہ

کرلیا۔ ۳ مارچ ۱۹۱۹ء کو پریسیڈنٹ ولسن نے فرمایا مجھے یقین ہے کہ دول متحدہ جمہوریت امریکہ کے تعاون واشتراک سے فلسطین میں یہودی کامن ولیتھ کی بنیاد رکھنے کے بارہ میں بالکل متفق ہیں۔ جنرل اسمٹس نے جو اعلان بالفور کے زمانہ میں کابینہ جنگ کے ایک ممبر تھے ۳ نومبر ۱۹۱۹ء کو فرمایا "میں سرزمین فلسطین پر مستقبل کی جلیل القدر یہودی سلطنت کا ہیولیٰ تیار ہوتے دیکھ رہا ہوں"۔ لیکن سب سے زیادہ صریح اور واضح بیان جو برطانوی حوصلوں کا حقیقی مظہر ہے وہ ہے جو وطن الیہود کے پہلے مجوز لارڈ بالفور نے دیا ہے، ۱۲ جولائی ۱۹۲۰ء کو لارڈ موصوف نے فرمایا "عربوں کو دول یورپ اور خصوصیت کے ساتھ برطانیہ عظمیٰ کا احسان فراموش نہ کرنا چاہئے کہ محض ان کی اعانت وہمدردی سے عرب اپنے فاتحین یعنی ترکوں کے وحشیانہ مظالم سے نجات حاصل کر سکے مجھے امید ہے عرب اس حقیقت کو بھی نہ بھولیں گے کہ ہم ہی ہیں جو محض عرب کے مفاد کیلئے عراق میں ایک آزاد ذمہ دار حکومت کے قیام کیلئے اس کا رستہ تیار کر رہے ہیں۔ ان تمام باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے عربوں کو اس بات پر ملال نہ ہونا چاہئے کہ سرزمین عرب کا ایک حقیر سا گوشہ (کیونکہ فلسطین تاریخی حیثیت سے جو کچھ بھی ہو لیکن جغرافی حیثیت سے اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک حقیر اور بے مایہ قطعہ زمین ہے) ان لوگوں کے حوالے کیا جا رہا ہے جو ہزاروں برس گذرے اس سے بچھڑ گئے تھے" یہود نے دول متحدہ میں سے صرف برطانیہ عظمیٰ سے منشور حاصل کر لینا کافی سمجھا اور باوجود سخت مخالفت کے یہ منشور برطانیہ نے اپنے زور و اثر سے کام لیکر انجمن اقوام میں پیش کر دیا۔ عربوں سے جتنے معاہدے کئے گئے تھے سب بھلا دئے گئے، حتیٰ کہ یہود نوازی کے جوش میں سائکز پیکاٹ کا صلحنامہ بھی ٹھکرا دیا گیا۔ ۲۲ جون ۱۹۱۹ء میں یہود سے متعلق برطانوی پالیسی کی وضاحت مسٹر چرچل نے ان الفاظ میں کی "سوال کیا جاتا ہے کہ فلسطین میں یہود کے قومی وطن بنانے کی تجویز کو استحکام عطا کرنیکا کیا مفہوم ہے۔ جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ ہمارا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ فلسطین میں دوسرے باشندوں پر یہود کو جماعتی حیثیت سے مسلط کر دیا جائے۔ مقصد صرف اتنا ہے کہ یہود فلسطین کو باہر والے یہودیوں کی اعانت وتعاون سے اتنی شوکت وقوت بہم پہنچائی جائے کہ فلسطین عالم صیہونیت میں ایک مرکزی حیثیت حاصل کرے اور جو اپنائے یہود کے لئے مذہبی اور نسلی اعتبار سے باعث فخر بن سکے"۔

جولائی ۱۹۲۲ء میں لیگ کاؤنسل نے منشور فلسطین پر اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی۔ ستمبر ۱۹۲۳ء سے اس پر باقاعدہ عملدرآمد شروع ہوگیا۔ اب عربوں کو سخت خطرہ لاحق ہوگیا۔ انھیں اپنی جائداد و املاک کی طرف سے بھی سخت اندیشہ پیدا ہوگیا چنانچہ ان کی دلجوئی یا ابلہ فریبی کیلئے دفتر نوآبادیات نے مسٹر چرچل کا میمورنڈم شائع کیا کہ فلسطین میں خالص یہودی حکومت کی بنیاد رکھنا برطانیہ کا منشا نہیں ہے اور نہ معاشرتی اور تمدنی حیثیت سے عربوں کو یہود کا محکوم بنانا مقصود ہے۔ منشا یہ ہے کہ فلسطین میں یہود کو دیگر اقوام کے برابر حقوق و اختیارات حاصل ہو جائیں اسی مقصد کو پیش نظر رکھکر انھیں دنیا کے دیگر ممالک سے ہجرت کی اجازت دی گئی ہے۔ یہودیوں نے ملک کے وسائل دولت و معاش ایک ایک کر کے اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ اور منشور کی ہر ہر دفعہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے ٹھان لیا کہ فلسطین کو اپنا قومی وطن بنا کے چھوڑینگے جب کبھی سلف گورنمنٹ کے نقطہ نظر سے ان کی پوزیشن پر اعتراض کیا گیا انھوں نے منشور کو سپر بنایا۔ اس ہنگامہ میں آزاد عرب کا تصور بالکل غائب ہوگیا یہود اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے میں اس درجہ منہمک اور سرگرم تھے کہ ایک زبردست مدبر کی رائے کے مطابق دنیا میں کم یہود ایسے ہوں گے جو منشور کو برٹش مینڈیٹ کی "کتاب مقدس" نہ سمجھتے ہوں۔

شا کمیشن اگر عرب فطرتاً شجاع اور جنگجو نہوتے اور اپنی جائز خواہشات کو پامال ہوتے دیکھ کر فلسطین کو ہنگامہ زار نہ بنا دیتے تو اس میں شک نہیں کہ برطانیہ اور یہود کے منصوبے کب کے پورے ہو چکے ہوتے لیکن جذبات آزادی اور اپنی فطرت سے مجبور ہو کر عرب مرنے اور مارنے پر تیار ہوگئے چنانچہ جب ۱۹۲۹ء کے ہنگاموں کے اسباب کی تحقیق کے لئے شا کمیشن کا تقرر ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ ابہام اور اجمال والی پالیسی کا دور گذر چکا ہے۔ اب اس سے کسی مزید فائدے کی توقع نہیں ہے۔ شا کمیشن کی رپورٹ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی کمیشن نے درخواست کی کہ برطانوی حکومت فلسطین کے متعلق اپنی پالیسی کی وضاحت کرے۔ ۱۹۲۲ء والے اعلان کی از سر نو توثیق و تصدیق کی جائے، اس لئے کہ منشور کی رو سے یہودیوں کو ملکی حکومت میں حصہ لینے کا کوئی استحقاق نہیں ہے۔

برطانوی وزیر اعظم مسٹر میکڈنلڈ نے حکومت کے رویہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ "ہم فلسطین کی تمام جماعتوں کے ساتھ انصاف سے کام لینا چاہتے ہیں اور ۱۹۲۲ء کے اعلان کے باب میں فریقین کے ساتھ وہی معاملہ

ہوگا۔ جو حق و انصاف کا تقاضہ ہوگا" لیکن جب کمیشن کی رپوٹ اور مسٹر میکڈانلڈ کا توضیحی بیان دونوں مجلس اقوام کے مینڈیٹ کمیشن کے سامنے پیش ہوئے تو ان پر سختی سے اعتراض کیا گیا۔ مینڈیٹ کمیشن اس فیصلے پر پہنچا کہ ہنگامہ و فساد کا بنیادی سبب گورنمنٹ کا اپنے فرائض کی طرف سے یکسر تغافل تھا۔ ملک کی زرعی اور تعلیمی حالت اور دیگر فوائد عالیہ کے شعبوں کی طرف سے گورنمنٹ کی بے اتفاقی فساد و انتشار کا باعث ہوئی، شا کمیشن کا یہ بیان کہ ہنگامہ و بغاوت کی آگ برطانوی حکومت کے خلاف نہیں بھڑکائی گئی ہے۔ حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔

شا کمیشن نے بالکل غیر ارادی طور پر برطانوی پالیسی اور برطانوی نظم و نسق کو عالم آشکار کر دیا۔ عرب اپنے مطالبات پر اڑے رہے۔ ۱۹۳۳ء میں لیڈروں نے اعلان کر دیا کہ گورنمنٹ کی پالیسی کا حقیقی مقصود یہ ہے کہ عربوں کو وطن سے بے وطن کرکے یہودیوں کو ان کی جگہ دیدیجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس اعلان میں کوئی بات بیجا نہ تھی۔ برطانوی مدبرین نے ۱۹۲۲ء میں جو کچھ کہا تھا یہ اس کا پرزور اور بے لاگ اعادہ تھا۔ یہودیوں کے اثر سے برطانیہ کیلئے یہ ناممکن ہوگیا کہ غیر ملکی یہودی مہاجرین کا داخلہ فلسطین میں ممنوع قرار دیدے۔ دوسری طرف عربوں سے حکومت کے غیر ہمدردانہ رویہ نے ان کو مفاد عامہ کے کاموں سے بالکل غافل کر دیا۔ لیکن یہ لطف کی بات ہے کہ سرکاری بیانات میں ہمیشہ فلسطین کی ترقیوں کا گیت گایا گیا۔ عربوں نے دیکھا ہم نہایت تیزی سے پستی و نامرادی کی طرف بڑھ رہے ہیں پس انھوں نے ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۶ء میں پے درپے بغاوتوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ ان بغاوتوں کی اصل وجہ مذہبی عصبیت ہے لیکن یہ بات نہیں ہے۔ ساری بغاوتیں برطانوی پالیسی کے ردعمل کے طور پر رونما ہوئیں۔ صیہونی انجمنیں ۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۵ء میں دو مرتبہ عربوں کے ذمہ دار اور آزاد حکومت کے مطالبات کی راہ میں پہاڑ کی طرح حائل ہوگئیں۔ خوفزدہ عرب آزادی کے مطالبے پر مصر ہیں اور "بہادر و شجاع" یہود برطانوی منشور کو سینے سے لگائے ہیں۔ بلاشبہ برطانیہ کے استعماری مقاصد کے لئے یہودیوں کا وجود ایک مفید بہانہ ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر وزمین نے ایک دوسرے موقع پر کہا ہے۔

"یہود ہمیشہ ایک آسان اور مفید بہانے کا کام دیتے رہے ہیں"۔

Scanned by CamScanner

تقسیم فلسطین | رائل کمیشن نے تقسیم فلسطین کی ایک تجویز پیش کی ہے۔ برطانوی حکومت اپنے زور قوت سے اس تجویز پر عمل کرنے کی پوری قدرت رکھتی ہے۔ یہودی ریاست کی بنیاد بھی رکھی جا سکتی ہے اور ساحل کے شاداب اور اہم مقامات پر برطانوی تسلط بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن جیسا کہ رائل کمیشن نے مسئلہ کی الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھانے کے لئے تاریخی حقائق سے کام لیا ہے ہم بھی چاہتے ہیں کہ "یہودی ریاست" کی بنیاد رکھنے سے پہلے ایک تاریخی نکتہ پر غور کر لیا جائے۔

ایک تاریخی نکتہ | یہود اور عرب کے تعلقات میں کبھی موجودہ تلخی اور ناگواری نہ تھی۔ یہ سعادت برطانیہ کیلئے مقدر تھی کہ دنیا کی ان گنت مشکلات میں عرب اور یہود کی نزاع سے ایک اور مشکل کا اضافہ کر دے۔ ۱۳۵ء میں رومیوں نے بیت المقدس کو مسمار کر ڈالا اور یہودیوں پر اتنے مظالم توڑے کہ وہ وطن کو خیرباد کہنے پر مجبور ہو گئے۔ اس زمانہ سے لیکر آج تک صرف ترک اور عرب یہودیوں کے ساتھ اخلاق و انسانیت کا برتاؤ کرتے رہے ہیں۔ فلسطین پانچسو سال تک رومی اور بازنطینی حکومت میں رہنے کے بعد مسلمانوں کے قبضہ میں آیا۔ عربوں کی فتوحات کے ساتھ ہی یہود بھی افریقہ کے شمالی ساحل پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل گئے یہاں تک کہ اسپین میں بھی پہنچ گئے۔ وطن کو خیرباد کہنے کے بعد اسپین ہی میں رفعت و ترقی کی بلند ترین سطح پر پہنچ سکے ان کو شہری زندگی کے تمام حقوق حاصل ہوئے۔ خلفاء انھیں اپنا وزیر تک بناتے تھے۔ حکومت کو انھیں اپنا وزیر مال تک بنانے میں کوئی تامل نہیں ہوتا تھا۔ یہود، سائنسداں، ڈاکٹر، طبیب اور فاضل و محقق سبھی کچھ ہوتے تھے۔ عبرانی شعر و ادب اور عبرانی علوم و فنون کو بھی اسی زمانہ میں ترقی ہوئی مشہور فاضل و محقق میمونیڈس (عرب اسپین میں پیدا ہوا بعد ازاں مسلم قاہرہ میں زندگی بسر کی۔

کامل ہم آہنگی | عرب اور یہود ہمیشہ پوری رواداری اور کامل ہم آہنگی کے ساتھ رہے یہودی قتل و خون کی پوری داستان جہاد عیسائیت سے متعلق ہے۔ صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں عیسائی مسلمانوں اور یہود

دونوں کے یکساں دشمن تھے۔ یورپ میں کسی یہودی کو قتل کرنا عیسائیوں کے نزدیک اتنا ہی بابرکت اور مستحسن فعل تھا جتنا بیت المقدس میں کسی مسلمان کو قتل کرنا۔ پھر جب پندرہویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں اسپین کی مذہبی عدالتیں منکروں اور ملحدوں کو زندہ جلانے لگیں تو وہ یہود جنھوں نے عیسائی مذہب قبول کرنے سے انکار کیا اسپین سے نکال دیئے گئے اور تاریخ کو یہ داستان یاد ہے کہ ان مظلوموں کو ترکی سلطنت کے بحرروم والے صوبوں، مصر، ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ وغیرہ نے پناہ دی اور ترکی سلطنت کے زیرسایہ یہود ایک بار پھر رفعت و ترقی کے بلند ترین بام پر پہنچ گئے۔

اس تاریخی پس منظر کے ہوتے ہوئے یہ امر تعجب انگیز ہے کہ یہود برطانوی سامراج کے لئے بہانہ بننا تو پسند کریں لیکن عربوں کے ساتھ رواداری کے ساتھ مل جل کر رہنا پسند نہ کریں۔ یقیناً ان کا یہ انتخاب کسی دوراندیشی اور دانشمندی پر مبنی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ عرب برطانوی اقتدار سے خوفزدہ ہو جائیں اور سپر ڈالدیں یا رشوت ان کے منہ کو بند اور ہاتھ پاؤں کو شل کر دے لیکن یہ امر مشتبہ ہے کہ برطانیہ زیادہ عرصہ تک اپنے استعماری مقاصد کو ایک حقیر سی یہودی ریاست کی خاطر قربان کرتی رہے گی۔ اور جب عربی حمیت اپنے حدود توڑ کر انتقام کے لئے آگے بڑھے گی تب وہ یہودیوں کی جانبازانہ حفاظت کرے گی۔

تفسیر سورہ اخلاص (اردو)

استاذ امام علامہ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۂ اخلاص کی تفسیر اردو میں لکھی ہے۔ اس سورہ کی ہر دور میں بیشمار تفسیریں لکھی گئیں۔ لیکن اہل نظر نے اعتراف کیا ہے کہ علامہ فراہیؒ کی تفسیر میں جو نکتے بیان ہوئے ہیں ان سے تمام تفسیریں خالی ہیں۔ کتابت و طباعت بہترین، کاغذ نہایت عمدہ۔

قیمت :- ۵ر

مینیجر

تقریظ و تبصرہ

دعوت عمل :- مولفہ مولانا محفوظ الرحمن صاحب نگرامی تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۷۰ صفحات کاغذ متوسط کتابت و طباعت معمولی۔ قیمت مرقوم نہیں۔ ملنے کا پتہ :- منصرم انجمن تبلیغ الاسلام نگرام ضلع لکھنؤ (اودھ)

انجمن تبلیغ الاسلام۔ نگرام ضلع لکھنؤ۔ ۱۵۔۱۶ برس سے نہایت خاموشی کے ساتھ مفید تبلیغی خدمات انجام دے رہی ہے۔ اچھوتوں اور بے خبر مسلمانوں کو اسلامی تعلیم و خصوصیات سے باخبر کرنے کے لئے ہرسال، آسان ہندوستانی اور ناگری زبان میں تبلیغی کتابیں اور رسائل شائع کرتی ہے اور اسلامی خصوصیات سے متعلق چھوٹے چھوٹے ٹریکٹ چھپوا کر مفت تقسیم کرتی ہے۔ ہمارے سامنے جو کتاب ہے وہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اسکی اشاعت کا مقصد مؤلف محترم کے الفاظ میں یہ ہے۔

"آپکی لاعلمی میں دشمنان دین نے آپکے مقدس دین اسلام، شارع اسلام علیہ الصلاۃ والسلام علماء و امراء اسلام کی تحقیر و تذلیل کی جو انسانیت سوز تدبیریں اختیار کی ہیں اور کررہے ہیں ان سے آپ کو باخبر کردیا جائے اور اس کے بعد غیرت ایمانی اور حمیت قومی کے نام پر آپ سے اپیل کی جائے کہ آپ بیدار ہو کر وقت کے بہت بڑے فرض کا احساس فرمائیں۔"

ہمارے خیال میں عام مسلمانوں اور خصوصیت کے ساتھ تبلیغ سے شغف رکھنے والوں کیلئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

جامعہ ملیہ دہلی سے مندرجہ ذیل کتابیں موصول ہوئی ہیں۔

بچوں کی کہانیاں :- مصنفہ مولوی عبدالواحد صاحب۔ سندھی استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۳۰ صفحے۔ کاغذ اچھا، کتابت و طباعت اور سرورق جاذب نظر قیمت ۲/

Scanned by CamScanner

یہ کتاب بچوں کی مخصوص نفسیات اور ان کے طبعی میلانات کا لحاظ کرکے لکھی گئی ہے۔ اس میں چار چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیاں ہیں، جو بچوں کے لب و لہجہ اور انکی عام بول چال میں بیان کیگئی ہیں۔ مصنف نے کہیں سے کوئی ایسا لفظ نہیں آنے دیا ہے جس کے سمجھنے میں بچوں کو دشواری پیش آئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، گوئی بچہ اپنے بستر پر یہ کہانیاں بیان کر رہا ہے۔ اور دوسرے سننے والے اس سے مزہ لے رہے ہیں۔ بچوں کی دلچسپی بڑھانے کے لئے کہانیوں کی مناسبت سے جابجا تصویریں بھی دیدی گئی ہیں۔ اس کتاب کو بچے تفریحاً پڑھیں گے۔ اور اپنے دماغ پر کسی قسم کا بوجھ نہیں محسوس کرینگے۔

ننھی مرغابی :۔ مصنفہ مولوی عبدالواحد صاحب سندھی استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۳۱ ص کاغذ عمدہ۔ کتابت وطباعت روشن سرورق نہایت خوبصورت قیمت ۲ر

مصنف نے اس کتاب میں تین کہانیاں لکھی ہیں۔ ہر ایک میں بچوں کے مذاق اور ان کے عام روزمرہ کی پابندی کی گئی ہے۔ انداز بیان اتنا دلچسپ و دلنشین ہے کہ کوئی بچہ شروع سے آخر تک ختم کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ حسب مواقع تصویریں دی گئی ہیں جن کی وجہ سے اس کو بچے اور ذوق و شوق سے پڑھیں گے۔

چھوٹا چمچو :۔ مصنفہ مولوی حسین حسان صاحب ندوی جامعی اڈیٹر پیام تعلیم۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۹ صفحے کاغذ عمدہ۔ کتابت و طباعت نہایت پاکیزہ سرورق مصور۔ قیمت ۲ر

اس کتاب میں ایک چوہے کے بچہ کی کہانی ہے۔ کہانی نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ اسکیں بچوں کی عام فطرت کا پورا پورا لحاظ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ہر بچہ کو پڑھنی چاہیئے۔ بچے اس کو پڑھکر خوش ہوں گے اور والدین کی فرمانبرداری کا بہترین سبق حاصل کریں گے۔

چھڈو :۔ مصنفہ رقیہ ریحانہ صاحبہ و دیگر حضرات۔ تقطیع ۲۰×۲۰/۱۶ حجم ۴۸ صفحے۔ کاغذ بہتر۔ کتابت وطباعت اور سرورق دیدہ زیب قیمت ۳ر

Scanned by CamScanner

اس کتاب میں چار قصے ہیں۔ "چھدوا اور باچھو" رقیہ ریحانہ صاحبہ نے لکھا ہے "آخری قدم" اور "پان کو" علی الترتیب ڈاکٹر محمود حسین خانصاحب اور جناب امتیاز حسین صاحب کے نتائج فکر ہیں۔ ہر قصہ کی زبان نہایت شیریں اور صاف ہے۔ پہلے دو قصے بچوں میں سیاحت و ترقی کا شوق اور ہر چیز کو کرنے اور پرکھنے کا جذبہ پیدا کرتے ہیں، آخر کے دو قصے نیکی و اخلاص کا سبق دیتے ہیں۔

کائنات :- مصنفہ جناب محمود علی خانصاحب جامعی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۸۰ صفحے کاغذ سفید دبیز کتابت و طباعت عمدہ قیمت ۵/

جغرافیہ طبیعی ایک مشکل فن ہے، بچوں کو تو چھوڑیئے۔ سیانوں کو اس فن کی باتیں سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے۔ عام طور پر اسکولوں میں، اس فن کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں انکا انداز بیان اسقدر ناقص اور مبہم ہوتا ہے کہ بچے مسائل رٹ لینے کے سوا اصل مطلب کو بہت کم سمجھتے ہیں۔ اور جو کچھ سمجھتے ہیں وہ بھی بار حافظہ ہوتا ہے لیکن پیش نظر کتاب کا حال یہ نہیں ہے۔ اس کا اسلوب بالکل نرالا ہے۔ اس میں ہر مسئلہ کو نہایت شگفتہ انداز میں سمجھا دیا گیا ہے۔ کوئی بات مبہم نہیں چھوڑی گئی ہے۔ اس کتاب کو اگر جغرافیہ کے ابتدائی طلبہ اپنے سامنے رکھیں تو انکو اس سے بڑی مدد ملے گی۔

دنیا کے بچے :- مصنفہ مولوی محمد حسین حسان صاحب ندوی، جامعی اڈیٹر پیام تعلیم تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۸۰، صفحے کاغذ اور کتابت و طباعت بہتر، سرورق مصور قیمت ۶/

اس کتاب میں افریقہ، فرانس، جاپان، رومانیا، چین، سوڈان، سوئٹزرلینڈ، اسپین، روس، جرمنی، اٹلی، اور ہالینڈ وغیرہ کے بچوں کے عادات و اطوار اور ان ملکوں کے عام جغرافیائی حالات و خصوصیات افسانہ کے انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ بچے ہر ملک کی آب و ہوا، طبعی خصوصیات رسم و رواج، کھانے پینے اور رہنے سہنے کے طور طریق سے باتوں باتوں میں واقف ہو جائیں۔

یہ تمام کتابیں مکتبہ جامعہ دہلی سے ملیں گی۔ ہماری رائے ہے کہ یہ کتابیں ابتدائی مدارس کے نصاب میں داخل کی جائیں۔

Scanned by CamScanner